ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

دسمبر/جنوری ۲۰۱۸/۱۹ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۷-۶ | ربیع الثانی/جمادی الاول ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdur Rehman Naeem, Mob. 9546692993; email-arehman412@yahoo.in

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	ایمان کی تجدید، وقت کی اہم ضرورت	محمد عارف ندوی
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر
		پانچ صوبوں کے انتخابات اور نتائج	۴
		ماب لنچنگ کا خوف اور گندی سیاست	۵
		اخوان دشمنی یا اسلام دشمنی	۹
۳	خاص تحریر	سعودی عرب کے حکمرانوں سے کچھ صاف.....	ترجمہ: محمد اعظم ندوی ۱۴
۴۔	پیام سیرت	دیکھ زمانے کے رنگ ہیں ہزار!	محمد فرید حبیب ندوی ۲۳
۵۔	نقد ونظر	تعمیری تنقید!	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۲۶
۶۔	احتساب	جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا	پروفیسر محسن عثمانی ندوی ۳۰
۷۔	قرآنیات	قرآن کریم سب سے قیمتی نعمت.....	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی ۳۳
۸۔	// //	تفسیر موضوعی اور نصابی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی ۳۸
۹۔	فقہی مباحث	اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل (قسط-۳)	محمد قمر الزماں ندوی ۴۹
۱۰۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۵۳
۱۱۔	انکار حدیث	ابوریّہ اور اس کی کتاب کے بارے میں چند باتیں	محمد فرید حبیب ندوی ۶۰
۱۲۔	تجزیہ	جدید ہندوستان، فرقہ پرستی، اور ملی قیادت	نجم الہدی ثانی ۶۳
۱۳۔	اقامت دین	دور حاضر میں اقامت دین ایک اہم فریضہ	نسرین فاطمہ ۷۳
۱۴۔	مردان حر	حضرت زبیر بن عوامؓ	عالم مرادآبادی ۷۸
۱۵۔	تعارف و تبصرہ	''دعوت اسلام اقوام عالم اور برادران وطن.....''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۸۶
		''معاشرتی زندگی کے اصول وآداب''	۹۲
۱۶۔	اخبار عالم	اخوان کے نائب مرشد عام ابراہیم منیر کی وضاحت	ترجمانی: محمد پاشا ندوی ۹۵
۱۷۔	نعت	ذکرِ جمیل	ماہر القادری

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

معذرت

قارئین کرام سے انتہائی افسوس کے ساتھ معذرت کی جاتی ہے کہ نومبر کا شمارہ ان کی خدمت میں نہ پہنچ سکا، ۱۱/ سال کی مدت میں یہ پہلا موقع تھا جب رسالہ شائع نہ ہوسکا، اب نومبر و دسمبر کا مشترکہ شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

دراصل بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب رسالہ کی طباعت میں کافی دشواری آرہی تھی، اس درمیان دیوبند کے ایک پرنٹر تشریف لے آئے، دیوبند کے بارے میں بڑے قصے سن رکھے تھے، کہ وہاں لوگ گراہک کو خوب نچاتے ہیں، اس سے کھیلتے ہیں، طباعت کے سلسلے میں کیے گئے وعدے کبھی پورے نہیں کرتے، چوری سے دوسروں کی کتاب شائع کر لیتے ہیں، یہ سب جانتے ہوئے بھی قلت وسائل کے سبب ان صاحب کی باتوں میں آگئے، محسوس ہوا کہ کچھ پیسے بچ جائیں گے اور ادارے کا فائدہ ہوگا، مگر یا اللہ! جب ٹال مٹول اور جھوٹ کا سلسلہ چلا تو وہ آخری لمحات تک چلتا ہی رہا تا آنکہ رسالہ کی پوسٹل تاریخ نکل گئی، ہم کفِ افسوس ملتے رہ گئے مگر اللہ کا شکر ادا کیا کہ کسی اور دام میں نہ پھنسے، بلکہ پہلی ہی مرتبہ میں اللہ نے بغیر کسی نقصان کے بچالیا، نقصان صرف یہ ہوا کہ یہ شمارہ نہ شائع ہوسکا جس کے لیے ہم پھر ایک مرتبہ معذرت خواہ ہیں۔

ساتھ ہی قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ اس رسالہ کو جاری رکھنے کے لئے اس کے ساتھ تعاون کریں، تاجر حضرات اپنے اشتہار دے کر اس کی معاونت کریں، علم دوست حضرات اس کے اعزازی معاونین بنانے کی فکر کریں، اور اہل ثروت علم وادب کی آبیاری کے لیے اس کی مالی مدد کریں۔

آپ ''ندائے اعتدال'' کا خصوصی تعاون کرنے کے لیے یا ممبران اپنی سالانہ رقم بھیجنے کے لئے اس اکاؤنٹ میں رقم بھیجیں اور اپنی رسید وتفصیلات واٹساپ کریں۔

والسلام

سعید احمد انصاری

(سرکولیشن انچارج)

Whatsapp No.
+91 9808850029

Bank Acount Detail:
Name: Seed Ahmad Ansari
A/c No.: 6561000100039197
IFSC Code: PUNB0656100
Punjab National Bank
Branch Add. Medical Road, Aligarh, U.P.

اداریہ

فکری زاویے

پانچ صوبوں کے انتخابات اور نتائج:

اس وقت ہم اس موضوع پر کوئی مفصل تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، کیوں کہ اس کے لیے موقع بھی نہیں اور پھر رسالہ بھی پہلے سے تیار تھا اس لیے اضافہ بھی دشوار ہے، تاہم یہاں کچھ اشارے کر دینا ضروری ہے۔

انتخابات کے نتائج آئے، ہم نے لوگوں کو خوشی کے شادیانے بجاتے دیکھا تو عقلوں پر ماتم کیا، ان نتائج پر ۲۰۱۹ء کو قیاس کرنا ہمارے نزدیک اگر حماقت نہیں تو خوش فہمی و غلط فہمی ضرور ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم کو ای وی ایم پر بھروسہ تھا، نہ ہے، بی جے پی کے ارکان کی پارلیمانی تقریر اس سلسلہ میں ہمارے شک کو دلیل فراہم کرتی ہے، پھر بی جے پی کے اقتدار سنبھالنے پر کانگریس نے بھی وہی سوالات دوہرائے، سپریم کورٹ میں اب بھی ایک درخواست دائر ہے جس پر سماعت باقی ہے، ۲۰۱۴ء کے عام انتخابات کو تبدیلی کا نام دے دیا گیا مگر اتر پردیش کے یک طرفہ انتخابات نے بہت کچھ کہانی سمجھا دی، پھر گجرات، کرناٹک اور گوا میں جو کچھ ہوا وہ سامنے ہے، صبح سے شام تک آگے پیچھے ہوتے رہے، اتار چڑھاؤ اور کشمکش کے بعد تھوڑے سے فرق سے جیت درج کی تاکہ شکوک وشبہات دور ہوں، یاد رکھنا چاہیے کہ مرکز میں بنے رہنے کے لیے کچھ ریاستوں کا سودا کیا جا سکتا ہے، مرغی پر قبضہ کرنے کے لیے بسا اوقات انڈوں کو قربان کرنا پڑتا ہے، ویسے بھی مقابلہ بہت قریبی رہا ہے، اور اگر ووٹ فیصد کا جائزہ لیجئے تو تقریباً برابر ہے، بس سیٹوں کا نقصان فائدہ ضرور ہوا ہے، ان انتخابات میں پرچار کے لیے یوگی جی کو زیادہ استعمال کیا گیا، یوگی جی وزارت عظمی کی دوڑ میں لگ گئے تھے، اس کے علاوہ خود بھاجپا میں اندرون خانہ بہت کچھ چل رہا تھا، ان اندرونی اختلافات اور یوگی جی کو دلی سے دور رکھنے کی پالیسی کے تناظر میں بھی ان نتائج کو دیکھنا چاہیے۔

اگر واقعی عوام مرکزی حکومت اور اس کی فرقہ وارانہ سیاست سے ناراض ہیں جیسا کہ کہا جا رہا ہے تو پھر قصہ اور ہونا چاہئے تھا، ہم بھی کہتے ہیں کہ اگر سب کچھ شفافیت سے ہوتا تو یقیناً نتیجہ کچھ اور ہی ہوتا، خبریں تو خوب آئیں کہ کہیں ای وی ایم مشینیں پکڑی گئیں اور کہیں کارکنان بھاجپائیوں کے ساتھ پکڑے گئے، اتر پردیش انتخابات تک ایکزٹ پول بی جے پی کو سو فیصد کامیاب دکھاتا تھا اور یہی نتیجہ ہوتا تھا، مگر اب ایکزٹ پول سو فیصد ناکام دکھاتا ہے اور پھر خود بی جے پی یا مد مقابل تھوڑے سے فرق سے کامیاب ہوتا ہے، ۲۰۱۹ء کے انتخابات کے لیے یہ ساری پالیسیاں تبدیل کی گئی ہیں۔

شادیانے یوں بھی نہیں بجانا چاہیے، ماب لنچنگ اور گئو رکھشکوں کے حملے ختم ہوں گے تو تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اٹھانے کا

دور شروع ہوگا، ایک نے ساڑھے چار سال سے خدا جیسی زبان بولنا شروع کیا تھا، تو دوسرا ۶۵ سال سے یہی کہتا آیا کہ ''لوٹ کے بدھو ادھر ہی آؤ گے، یہاں کے علاوہ اور کہاں جاؤ گے''، ویسے بھی ہمارے پاس نہ قیادت ہے نہ کوئی منصوبہ، ہماری حمایت تو غیر مشروط اور اھون الشرین اور اُھون البلتیسن کو اختیار کرنے کے قبیل سے ہوتی ہے، یہ نتیجہ اس غیر مشروط حمایت کا ہے جو کئی دہائیوں سے چلی آرہی ہے، جس نے کبھی نئی راہیں تلاش نہ کرنے دیا، یاد رکھیے اس تاریخی حقیقت کو کہ ۱۹۷۹ء سے اب تک صرف مفتی سعید کو چھوڑ کر کبھی بھی ملک کا کوئی وزیر داخلہ ایسا نہیں ہوا جو آر ایس ایس کا غلام نہ ہو، ایمرجنسی میں آر ایس ایس کے لوگوں کی خوب گرفتاریاں ہوئی تھیں، پھر اندرا گاندھی کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا تھا، ۱۹۷۹ء میں انھوں نے آر ایس ایس سے سمجھوتہ کر لیا، اقتدار میں واپس آ گئیں اور تب سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ حکومت کسی کی ہو، وزیر اعظم کوئی ہو مگر وزیر داخلہ آر ایس ایس کا ہوتا ہے، مسلمانوں پر نت نئے مظالم کی داستانوں اور بدلتی پالیسیوں کو نظر میں رکھیے اور اس پہلو سے تجزیہ کیجئے، صرف خوشیاں مت منائیے، بلکہ لوگوں کو منصوبہ بندی پر مجبور کیجئے تا کہ کل نہیں تو آئندہ ۵ سال بعد کوئی ایسا آپشن ہو جس کا سہارا لے کر کسی کی بھی مشروط حمایت کی جا سکے، جس طرح تلنگانہ میں ٹی آر ایس اور دہلی میں عام آدمی پارٹی کا آپشن موجود ہے۔

ماب لنچنگ ارتداد و فرار اور خوف و ہراس کی گندی سیاست:

گذشتہ ساڑھے چار سالوں کے درمیان خوف و ہراس کی سیاست عروج پر پہنچ گئی ہے، اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہی اس ملک میں خوف و ہراس کی سیاست کی گئی، اپنے آپ کو جمہوریت نواز کہنے والی پارٹیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو ڈرایا اور ووٹ لیا، مگر افسوس کہ مسلمان ان ہی کی سرپرستی میں مارے اور کاٹے جاتے رہے، بالآخر جس سے وہ ڈراتے تھے اسی نے اقتدار پر اس طرح قبضہ کیا کہ سب کو بے دست و پا کر دیا، اس عرصہ میں خوف و ہراس کی سیاست اس درجہ کو پہنچ گئی کہ ہر آدمی اپنی جان، اور عزت و آبرو کو لے کر پریشان نظر آنے لگا، ماب لنچنگ اور ارتداد کا ایسا خوف پھیلایا گیا کہ لوگ سہمے سہمے رہنے لگے، اس طرح کے واقعات خواہ لنچنگ کے ہوں یا ارتداد اور فرار کے، ہمیں ہمیشہ سوچنے پر مجبور کرتے رہے، ان موضوعات پر لکھنے والوں سے ہمیشہ تحقیق در تحقیق کا مطالبہ کرتے رہے۔

سطور ذیل میں ہم ابھی حال ہی میں ہونے والے واقعہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہیں گے، ایک چھوٹے سے بچہ عظیم کی ایک ناگہانی حادثہ میں جان چلی گئی، لوگوں نے ہنگامہ کیا، اس کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی، غیروں کی طرف سے منصوبہ بند قتل قرار دیا، لنچنگ کا خوف پھیلایا، سی سی ٹی وی کیمرے میں قید فوٹیج سامنے آئی تو صاف معلوم ہوا کہ یہ لنچنگ کا واقعہ نہیں ہے، قصہ دراصل یہ ہے کہ عظیم کی موت واقعاتی تھی مگر اس کی موت کی آڑ میں سیاست ہو رہی تھی اور سیاست میں اس مدرسہ کے مولوی صاحب بھی شریک تھے، ان کے پاس دراصل وقف کی املاک ہے، اس پر کچھ کمرے بنے ہوئے ہیں جو کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں، جس کا کرایہ وہ وصول کرتے ہیں، اسی لیے وقف بورڈ اس پر باؤنڈری نہیں کراتا، وہاں موجود دلتوں کی آبادی کو ادھر سے ہی راستہ

چاہیے اسی مسئلہ کو لے کر آئے دن کھینچ تان اور کہا سنی ہوتی رہتی تھی، اس دن بچوں بچوں کی آپس میں لڑائی ہوئی، عظیم کا سر اسکوٹر سے ٹکرایا اور ناگہانی طور پر اس کی موت ہوگئی، لوگوں نے اس کو فرقہ وارانہ رنگ دینا شروع کیا، مولوی صاحب نے بھی سوچا کہ اسی ہما ہمی میں باؤنڈری ہوجائے، جبکہ حکومت نے پانچ لاکھ روپیہ معاوضہ دینے کا اعلان کر دیا تھا اور عظیم کے والد کو وقف بورڈ میں نوکری دینے کی یقین دہانی کرائی تھی، یہ تھا وہ واقعہ جس پر ہائے توبہ اور واویلا مچائی گئی، اب ان سطروں میں ذرا اپنی ہی قوم کا چہرہ دیکھا جائے تو دل کی کیفیت عجیب سی ہونے لگتی ہے۔

سوال تو یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وقف کی املاک پر قبضہ کس کا ہے، کمروں کا کرایہ کس کو جاتا ہے، قانون کی رُو سے وقف کا متولی مسلمان ہوگا، وقف تا قیامت وقف رہے گا، وقف کی آمدنی مسلمانوں پر مستعمل ہوگی، وقف کے ملازمین مسلمان ہوں گے، پھر آخر وقف کو نقصان کون پہنچا رہا ہے، وقف کی جائیدادیں کہاں ہضم ہوگئیں، شاید ہی ہندوستان سے زیادہ کہیں اور مسلمانوں کے اوقاف ہوں، حقیقت حال جاننے والوں کا کہنا ہے کہ وقف کی املاک کا اگر صحیح استعمال ہو اور صحیح طور پر اس کی آمدنی مسلمانوں پر خرچ کر دی جائے تو مسلمانوں کی پسماندگی بالخصوص تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لئے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں، مگر وقف کی جائیدادوں پر یا تو حکومتوں کے ناجائز قبضے ہیں اور سودو سو کرایہ دے دیا جاتا ہے، یا پھر حکمراں جماعتوں کی شہ پر اثر ورسوخ رکھنے والوں نے قبضہ کر رکھا ہے، کسی کی کوٹھی ہے، کسی کا بنگلہ ہے، کسی کا آفس ہے، کمیٹیاں ہیں، لاکھوں اور ہزاروں میں جس کا کرایہ ہونا چاہیے وہ چند روپیوں میں محدود ہے، نئے قانون کے مطابق کرایہ میں کوئی اضافہ نہیں، کاش ملت کا کوئی درد رکھنے والا پتہ کرتا کہ کس کس صوبے میں وقف کی املاک کی تعداد کتنی ہے، کس کس نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے قبضہ کر رکھا ہے، اور اس کی آمدنی کا فائدہ اس کو پہنچ رہا ہے، یا قوم وملت کو، یہ کرنے کا کام ہے اور بہت اہم کام ہے، یہ کام کوئی حکومت نہیں کرے گی بلکہ مسلمانوں کو ہی کرنا پڑے گا، کیوں کہ حکومت تو اس کی پشت پناہی کرتی ہے، جس کے پاس ووٹ بینک ہوتا ہے اور جس کے پاس ووٹ بینک ہوتا ہے وہی قابض ہوتا ہے۔

بہرحال ماب لنچنگ سے بات پہنچ گئی وقف کی املاک تک، ماب لنچنگ کے کئی ایک واقعات ایسے بھی ہوئے جو واقعی ظلم و تشدد کی جیتی جاگتی تصویر تھے، مگر ان پر ہائے واویلا کے علاوہ ہم کوئی ٹھوس اقدام بھی نہ کر سکے، بلکہ اپنے بے جا بیانات سے قوم کو بزدل بنانے کا کام ضرور کیا۔

دوسرا نکتہ جس کو یہاں واضح کرنا مقصود ہے، اس کا تعلق بھی خوف وہراس سے ہے، ایک مہم اس کے لئے چلائی جاتی ہے، ہم مسلمان غیر شعوری طور پر اس کا حصہ بن جاتے ہیں، چند دنوں قبل ہر طرف سے یہ خبر آنے لگی کہ لڑکیاں مرتد ہو رہی ہیں، غیروں کے ساتھ بھاگ رہی ہیں، اپنا مذہب تبدیل کر رہی ہیں، غیروں نے اس کے لئے مہم چلا رکھی ہے، اول تو ہمارے نزدیک یہ بات اس قدر سچی نہیں جتنی بیان کی گئی، ہاں کچھ واقعات رونما ہوئے ہیں اور ہوتے رہے ہیں، جس سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بعض مرتبہ تو غیرت سے زمین میں گڑ جانے کو جی چاہتا ہے، مگر اس کا علاج وہ نہیں جو مسلمان کر رہے ہیں، اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ غیروں نے ایسی مہم چلا رکھی ہے، تو کیا اس کا جواب یہ ہے کہ ہم مہم سوشل میڈیا پر چلائیں، کسی علاقہ میں کوئی واقعہ ہوجائے تو سوشل

میڈیا سے خود ہی اس کی تشہیر کریں، منصوبے بنانے اور میٹنگ کرنے کے لئے بھی عام اعلانات جاری کریں، اگر ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو پھر پس پردہ مقصد کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے، مزید ہم غیروں کے منصوبوں کو کامیاب بنانے میں معاون بنتے ہیں، یہ تو ایسے ہی ہوا کہ کوئی دشمن خدا اور دشمن رسول دین کے خلاف یا نبی اسلام کے خلاف لکھ کر کسی مسلمان کو بھیج دے، اور پھر وہ مسلمان اس کی تشہیر کرنے لگے اور اس قدر ارسال کیا جائے کہ پوری دنیا تک اس کی تشہیر ہو جائے، اور اس تشہیر کا ذریعہ خود مسلمان بنیں، یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی ایسے واقعہ پر مسلمان آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، گستاخی پر پھانسی کی سزا کے مطالبے دوہراتے ہیں، اور سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرتے ہیں، مگر کبھی بے چاروں کو کرنے کے اصل کام تعارف اسلام اور دعوت دین کی طرف توجہ دینے کی نہیں سوجھتی، اس طرح اغیار منصوبہ بند طریقہ سے روزنئی پھلجڑی چھوڑتے ہیں، ہمارے جذبات سے کھیلتے ہیں، اور ہم بجائے ٹھوس کام کرنے کے ان کی سازش کا شکار ہو کر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور قومی توانائی ان کاموں میں خرچ ہوتی ہے، جن کا نہ کوئی مثبت اثر پڑتا ہے اور نہ جن پر کوئی توجہ دیتا ہے، بلکہ اس طرح کے انداز فکر اور طریقوں سے غیروں کو ہم بتاتے ہیں کہ دیکھو ہم مجبور ہیں، سوائے واویلا کے کچھ نہیں کر سکتے، انھیں کامیابی کا احساس دلاتے ہیں، انھیں اپنی مہم تیز کر دینے کی دعوت دیتے ہیں، اپنی قوم کے لوگوں کو بزدل بناتے ہیں، کہ اب تو لوگ اس قدر جری ہو گئے ہیں کہ گھروں سے بہن بیٹیوں کو لے جا رہے ہیں، حالانکہ یہ وقت تھا کہ قوم کو حوصلہ دیا جاتا، ہمت بندھائی جاتی، شعور وادراک کے ساتھ منصوبے بنائے جاتے، **مگر افسوس صد افسوس کہ شاید مسلمانوں کے پاس کوئی مقصد نہیں، کوئی ہدف نہیں، اور ظاہر ہے کہ جس قوم کی نظر ہدف پر نہیں ہوتی جسے دوست دوشمن کی تمیز نہیں ہوتی، وہ اس دنیا میں وقت گذاری کرتی ہے، اس کا اعلیٰ طبقہ بھی بے وقت کی شہنشائیاں بجاتا ہے، ہر ایک اپنا راگ الاپتا ہے، مصلحتوں کے نام پر قوم کو بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے، اچھے خاصے ذہین لوگ بھی بے وجہ اور بے وقت اور بے جا اختلافات کو ہوا دیتے ہیں، نوجوان بے جا مباحثوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، ایک دوسرے کی تردید، تذلیل، تنقیص، اور اس سے آگے بڑھ کر تکفیر کی مہم چلنے لگتی ہے، قسم بخدا اگر غیر مسلم صحیح طور پر ہماری تحریریں پڑھنے لگیں اور سمجھنے لگیں تو وہ سمجھیں گے کہ ان کو مٹانے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں یہ تو خود ہی مٹ جائیں گے، یہ خود ہی ایک دوسرے کی نفی وتنقیص کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے، یہ خود ہی ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے، ٹانگیں کھینچنے اور اکھاڑ پچھاڑ کرنے میں مصروف ہیں، یہ وہ منظر نامہ ہے جو سوشل میڈیا پر نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ فارغین مدارس کے پاس وقت ہی وقت ہے یا بے کاری ہی بے کاری ہے، سوائے سوشل میڈیائی چٹخاروں کے کوئی اور کام ہی نہیں۔**

بہر حال بات لڑکیوں کے راہ فرار اختیار کرنے اور مذہب تبدیل کرنے اور اس کو خوف وہراس کی ایک مہم بنانے کی ہو رہی تھی، یاد رکھیے کہ تاریخ کے ہر دور میں ایسے واقعات ہوئے ہیں اس لیے اس کو مہم سمجھانا اور مہم کے طور پر پیش کرنا غلط ہے، مسلمان لڑکے ہندو لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں اور وہ لڑکیاں مسلمان بھی ہو جاتی ہیں، اس کے برعکس بھی واقعات ہوتے ہیں، واقعات تو ایسے بھی ہوئے ہیں کہ بہت دین دار گھرانوں کی بچیاں بھی غیروں کے ساتھ فرار ہوئی ہیں اور مذہب تبدیل کیا ہے، پھر دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کی محنت سے بعض لڑکیاں اپنے مذہب میں واپس بھی آئی ہیں، اس لیے ضرورت اس کی

ہے کہ اس کے بنیادی اور حقیقی اسباب پر غور کیا جائے اور ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔

ہمارے یہاں کا مخلوط نظام تعلیم، تکثیری معاشرے کے اثرات، گھروں میں موجود بے دینی، والدین کی آزاد مزاجی، اولاد کی دینی تربیت سے بیزاری، خواتین کے لیے وعظ وتذکیر اور دینی تعلیم وتربیت کا نہ ہونا، یہ اور اس جیسے بے شمار اسباب ہیں جو ہماری اولادوں کو ذہنی اور فکری ارتداد میں پہلے سے ہی مبتلا کر دیتے ہیں، جس کا نتیجہ بسا اوقات وہ ہوتا ہے جو قومی غیرت کے لیے بھی ایک سانحہ بن جاتا ہے، صورت حال یہ ہوتی ہے کہ مرد کبھی دینی اجتماعات میں شریک ہو جاتے ہیں مگر گھر کی خواتین محروم، کم از کم مردوں کے کان میں جمعہ کی تقریر ہی زبردستی پڑ جاتی ہے یا نماز کے بعد پڑھی جانے والی کتابیں سن لیتے ہیں عورتوں کو اس سے بھی محروم رکھا گیا، ایسا بھی خوب دیکھا گیا ہے کہ مرد بظاہر بڑے دیندار نظر آتے ہیں مگر خواتین فیشن میں ڈوبی ہوئی اور غیر دیندارانہ رویہ کی عادی ہوتی ہیں، اور یہ دیندار حضرات اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے، شادی بیاہ اور گھر میں آنے جانے والوں کے آزادانہ اختلاط کے پُر خطر ہونے کا کبھی احساس تک نہیں ہوتا، خواتین کے لیے روزانہ، ہفتہ واری یا ماہانہ کسی حلقہ درس، حلقہ تربیت یا دینی تذکیر کا انتظام بھی نہیں ہوتا، بچیاں اسکول کے ماحول اور باہر کے ماحول اور اس سے زیادہ ٹی وی وانٹرنیٹ کی نشریات کے بعد اگر ماں باپ کی تربیت اچھی نہ پائیں، اس سے آگے بڑھ کر ماں باپ اور گھر میں بھی وہی ماحول پائیں تو نتائج کا خطرناک اور بھیانک ہونا یقینی ہے۔

اس کا حل یہ نہیں کہ ہم سوشل میڈیا پر اپیلیں کریں، اعلانات کریں اور ہنگامہ کریں اور دشمن کو بتائیں کہ تم کامیاب ہو اس لیے ہم ماتم کناں ہیں، ہم خواتین پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں کہ دشمنان اسلام خود اسلام پر انگلیاں اٹھانے لگیں، کیوں کہ اسلام پر معترضین کے سب سے زیادہ حملے حقوق نسواں کے ہی عنوان سے ہوتے ہیں، اور اسی حوالہ سے ہماری بچیوں کو ورغلایا بھی جاتا ہے اور پھر ہمارے صحیح ذہنی دینی تربیت نہ کرنے کے سبب وہ خود اس حوالہ سے شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتی ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ ہماری تنظیمیں ''تربیت اولاد'' پر مسجد مسجد ورکشاپ کی فکر کریں، بچیوں کی مکتب کی تعلیم کی فکر کریں، بچپن میں ہی دین کی جڑیں زندگی میں پیوست کر دیں، گھر کے ماحول کو دینی بنائیں، گھر کے ماحول میں بے حیائی اور بے شرمی کے ماحول سے اجتناب کریں، دینی تعلیم و تربیت کے حلقے قائم کرنے کا اہتمام کریں، قرآن مجید کے واقعات ضرور سنائیں، شرک کی شناعت اور کفار ومشرکین کے انجام سے ضرور باخبر کریں، کبائر کی شناعت سے واقف کرائیں، دوسروں سے میل جول اور غیروں سے سلوک کے آداب وحدود سے اچھی طرح واقف کرائیں، اسکول وکالج جانے والی بچیوں کے سامنے عورت پر اسلام کے احسانات اور عورت کے حقوق ضرور بیان کریں، ان پر واضح کریں کہ اسلام نے جو حقوق عورت کو عطا کیے وہ سراپا رحمت ہیں، ان میں عورت کو خود مختاری دی گئی ہے، اسے سماج کا لازمی ستون سمجھا گیا ہے، کہیں بھی اس کو مجبور ولاچار نہیں بنایا گیا ہے، یہ سب اس لیے کہ کہیں شیطانی تحریکیں اس کو آزادی واختیار اور حقوق کے نام پر اپنا شکار نہ بنالیں، معذرت کے ساتھ ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ ہمارے یہاں صحیح معنی میں دینداری نہ ہونے کے ساتھ ساتھ عورتوں کے معاملہ میں بے اعتدالی ہے، یا تو اس قدر سختی ہے کہ عورت خود کو مجبور ومعذور سمجھنے لگے اور اندر ہی اندر وہ اپنے سماج سے متنفر ہونے لگے یا ایسی آزادی ہے جو شرم وحیا کو بیچ دینے پر بھی اف نہ کرے، ضرورت ہے کہ اسلام کی روشنی میں توازن واعتدال قائم کیا

جائے اور صحیح طور پر اسلامی تربیت کی فکر کی جائے، کوشش کریں کہ بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے ذہنی اور فکری طور پر سچے پکے مسلمان بن چکے ہوں، یہ تب ہی ممکن ہے جب گھر کا ماحول صرف ظاہری دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ حقیقی اور فکری طور پر دیندارانہ ہوگا، **یاد رکھیے گھر میں دین کی جڑیں جتنی مضبوط ہوں گی بچے اسی قدر سچے پکے مسلمان بنیں گے**، یہ وہ کام ہیں جو اس سلسلہ میں کرنے کے ہیں، ورنہ ان واقعات کو قومی وملی مہم بنانے سے بخدا کچھ نہ حاصل ہوگا، سوائے اس کے کہ خوف کا ماحول پیدا ہوگا، دشمن اور جری ہوگا، اپنی ہی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوگی، البتہ اپنا اپنا تجویز وتیار کردہ نسخہ ضرور مارکیٹ میں متعارف ہوجائے گا، لیکن اس تعارف کے لیے اتنی بڑی قیمت چکانا کہاں کی دانشمندی ہے؟ خدارا خاموش محنت کے لئے اپنے گھر، اپنے محلّہ اور اپنی مسجد سے کام شروع کیجئے تاکہ آئندہ اس طرح کے واقعات رونما نہ ہوں، جو ہوگئے ان پر واویلا کرنے کے بجائے ان کی ہدایت کی فکر اور آئندہ ایسے حادثے نہ ہوں اس کی پیش بندی اور عملی وخاموش مہم کی ضرورت ہے۔

ان دونوں نکتوں کے ضمن میں آخری بات یہ عرض کرنا ہے کہ متعدد جدید وسائل نے جہاں بہت فائدے پہنچائے ہیں وہیں ان سے بہت سے نقصانات ہوئے ہیں، اس لیے جب اس طرح کا کوئی آڈیو/ ویڈیو یا خبر سامنے آئے تو اس کی مکمل تحقیق کے بعد ہی اس کو آگے بڑھایئے، ہمارا قومی انتشار کیا کم تھا، مگر اب تو سوشل میڈیا نے اس انتشار میں ذہنی، فکری اور تنظیمی وجماعتی سطح پر مزید اضافہ کردیا ہے، کسی کی بھی پگڑی اچھالنا، گالیاں دینا، الزامات لگانا، حسب نسب تک کے نقائص تلاش کرکے بیان کردینا ایک عام سی بات ہوگئی ہے، اس سلسلہ میں اداروں اور تنظیموں کو باقاعدہ تربیت پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ بات بہت دور نکل جائے گی، بالخصوص بڑے اداروں اور تنظیموں کو تربیتی اعتبار سے اس جانب توجہ دینے اور آداب اختلاف اور اصول تحقیق سکھانے اور اس پر باقاعدہ ورکشاپ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ جو وبا پھیل رہی ہے اس کے اثرات بڑے مہلک ہوں گے، ساری حدیں ٹوٹ جائیں گی، بدگمانیاں عام ہوں گی، سب بے لگام ہوں گے، عقل وشعور سے آزاد ہوں گے، ملی انتشار میں دن بدن اضافہ ہوگا، وسائل سے بھاگنا یا ان پر پابندیاں عائد کرنا تربیتی اصولوں کی رُو سے درست ہے نہ نفسیاتی اعتبار سے، وسائل کا استعمال سکھانا، ان سے فائدہ اٹھانا، تحقیق کا مزاج پیدا کرنا اور فکر میں توسع پیدا کرنا ہی واحد حل ہے جس پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔

اخوان دشمنی یا اسلام دشمنی:

خلیجی ممالک کی صورت حال آج کل انتہائی دھماکہ خیز ہے، حالات صبح وشام تبدیل ہورہے ہیں، ہر طرف سراسیمگی ہے، بالخصوص جمال خاشقجی کے علانیہ اور بہیمانہ قتل کے بعد ہر شخص ڈرا اور سہما ہوا ہے، اس واقعہ کی تفصیلات لکھنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں، مگر ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ترکی کو تمام مصالح سے بالا ہوکر سخت ترین موقف اپنانا چاہیے تاکہ قتل وخون اور استبداد کو روکنے کے لئے یہ جو موقع ملا ہے، وہ یوں ہی ہاتھ سے نہ جائے، حالانکہ یہ بات عیاں ہے کہ ترکی چومکھی لڑائی لڑ رہا ہے، وہ خطہ کے حالات کو مزید کشیدہ نہیں کرنا چاہتا جبکہ اس کے پاس سعودیہ کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں اور ترکی مخالف سیاست کا جواب دینے کا یہ بہترین موقع تھا۔

یہاں دراصل یہ نکتہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اخوان دشمنی کے نام پر سعودیہ کی سربراہی میں جو مہم چلائی گئی وہ دراصل اخوان دشمنی نہیں بلکہ اسلام دشمنی ہے، تاریخ اور تاریخی حقائق اس کے شاہد ہیں کہ اخوان کی جانب سے کبھی انتشار وافتراق اور جبر و تشدد کی پالیسی کی حمایت نہیں کی گئی، بلکہ ان کے اتحاد کی کوششوں کو لے کر ان پر شیعیت نواز ہونے کا بھی الزام لگا، اس تحریک نے تعلیم واقتصاد اور صلح واصلاح کو جس قدر فروغ دیا اس کی اپنی ایک تاریخ ہے، ہزاروں شخصیات کو قربان کر دینے اور سفاک وظالم لوگوں کی گولیاں سینوں پر کھانے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ امن پسندی کا نعرہ بلند کیا، پورے عالم عربی کی یونیورسٹیوں میں اخوانی چھائے رہے، علوم شریعت ہوں یا عصری مضامین ہر دو جگہ اخوانیوں کا جادو سر چڑھ کر بولا، اخوانیوں کی خطا صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ امت کے سامنے دین کا جامع تصور پیش کرتے ہیں، وہ دین کو تقسیم نہیں کرتے بلکہ دین کو ایک اکائی کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہ جس طرح تربیت کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں ظاہر و باطن، شریعت وطریقت، دین ودنیا کے تضادات وجود میں نہیں آتے، وہ امت کو اس کی ذمہ داری اور اس کے فرائض منصبی یاد دلاتے ہیں، اس کو کسی ایک شعبہ میں محدود کر دینے کے قائل نہیں، مغرب جو اسلام مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے وہ عبادات تک محدود ہے، بلکہ عبادات کے بھی کچھ حصوں پر ہی مشتمل ہے، بقیہ مغرب کی خواہش ہے کہ مسلمان غیروں کا دست نگر اور غلام بن کر رہے، جس پر ہمارا بڑا طبقہ ذہنی طور پر مطمئن اور فکری طور پر راضی بھی ہے، مگر اخوان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ جس دین متین کی تبلیغ کرتے ہیں وہ برپا ہی کیا گیا ہے تمام ادیان پر غالب آنے کے لئے، ان کی تبلیغ اس دین کی ہوتی ہے جو مکمل اور جامع نظام حیات ہے، جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی اور دنیا کی زمام قیادت کو سنبھالنے کا داعی ہے، جو انسانوں کو غلام بنانے کے بجائے آزادی کا تصور دیتا ہے، جو ظلم وتشدد کے بجائے امن وسلامتی اور خود مختاری کا سبق پڑھاتا ہے، جو انسانوں کی تذلیل کے بجائے انھیں عزت نفس کا احساس دلاتا ہے، جو مصائب ومشکلات سے دوچار کرنے اور انسانوں کے گرد حصار بنانے کے بجائے دین کے دامن رحمت وسعت میں پناہ دیتا ہے۔

اس نظریہ کی تبلیغ وترویج وترسیل مغرب کسی طور پر قبول نہیں کر سکتا، مغرب میں پالیسیاں بنائی ہی اسی لئے جاتی ہیں کہ اس کی بالادستی اور تسلط کیسے قائم رہے، عالم عربی میں اٹھنے والی عوامی لہر مغرب کا تسلط ختم کرنے کے لئے ایک الارم تھی، کیوں کہ مغرب کے تعاون سے قائم ڈکٹیٹر حکومتیں عوامی حقوق کی پامالی اور عوامی آزادی کو سلب کر کے ہی قائم تھیں، دوسری طرف عوام میں اصلاح و بیداری کی مہم نے انھیں آمادۂ انقلاب کیا، ڈکٹیٹر حکومتوں کو اس انقلاب کی لہر میں اگر اپنا تخت بہتا ہوا نظر آیا تو مغرب کو بھی اپنا تسلط ختم ہوتا نظر آیا، ظاہر ہے کہ تبدیلی کے اس عمل میں اخوانی تحریک، اخوانی لٹریچر اور اخوانی فکر سے ہم آہنگ حضرات کے افکار وکتب کا بڑا حصہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ پھر مغرب کے حکم پر سعودیہ کی سربراہی میں اخوان دشمنی کی مہم چلائی گئی، ہزاروں لوگوں کو شہید کیا گیا، ہزاروں کو قید کیا گیا، کتنے افراد ایسے ہیں جن کے جسموں کو تیزاب وکیمکل کے ذریعہ گھلا کر نیست ونابود کر دیا گیا، جن لوگوں کو سعودیہ نے کبھی اسلام کی خدمت کے لئے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا تھا وہ سب اس کی نظر میں معتوب ہو گئے اور دہشت گرد قرار دیے گئے، کیوں کہ در حقیقت وہ اسی تبدیلی کے داعی تھے، جس تبدیلی کے ذریعہ امت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو، دین کا غلبہ ہو، اسلامی تہذیب کی بالادستی ہو،

اسلامی صنعت وتجارت کا فروغ ہو، نظام معاشرت سے لے کر تعلیم وسیاست تک سب کا رنگ اسلامی ہو، معلوم نہیں یہ کون سا اسلام ہے جس کی نمائندگی سعودی عرب کرتا ہے، اس اسلام میں ظاہری طور پر سفید پوشی اور غطرہ وسلیپر دینداری کا مظہر ہیں، مگر علماء وفقہاء اور داعیان اسلام کا قتل اوران پر تشدد دین کی قطعی مخالفت نہیں، بدقسمتی یہ ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران امت کا جو ذہن تشکیل پایا وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ اگر کسی چیز کا مصدر فلاں ملک، فلاں ادارہ یا فلاں تنظیم وشخصیت ہے تو وہ چیز درست ومعتبر ہے، خواہ کتاب وسنت اس کے سلسلہ میں خاموش ہوں، سعودیہ نے اس ذہنیت کو فروغ دینے میں بڑی جدوجہد کی ہے اور پچھلی کئی دہائیوں سے وہ اسی بنیاد پر امت مسلمہ کے دینی جذبات کا استحصال کر رہا ہے، اگر امت میں تحقیق وتدقیق کا اسلامی مزاج باقی رہتا تو بیک زبان ہوکر کہتی کہ اس وقت سعودیہ جس اسلام کی نمائندگی کر رہا ہے وہ دراصل وہ اسلام نہیں جو نبی پاکؐ لے کر آئے تھے، خواہ سعودیہ کے اس اسلام کی تبلیغ امام حرم کریں یا اس پر مفتی بلاد حرمین مہر تصدیق لگائیں مگر اس کا کوئی رشتہ اس اسلام سے نہیں ہوسکتا جس کو امت محمدیہ نے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ آخر تبدیلی کی اس کوشش سے کیا فائدہ ہوا جس کے نتیجہ میں لاکھوں بے گھر ہوئے، شہید ہوئے، بھوکے مرنے پر مجبور ہوئے، ان سے ہم صرف دو باتیں عرض کرنا چاہیں گے، یہ دنیا اور مغربی دنیا آپ سے کسی حال میں خوش نہیں ہو سکتی خواہ آپ تبدیلی کی کوئی راہ اختیار کریں، کوئی طریقہ اپنائیں، یہ خوش تب ہی ہوگی جب اس کی تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں اور دل وجان سے اس کی غلامی کو تسلیم کرلیں، ترکی میں اسلام پسندوں نے کس خاموش اور پرسکون طریقہ سے تبدیلی کی مہم چلائی، مگر جوں ہی اسلام کا نام لینا شروع کیا تو بغاوتیں، عداوتیں اور لعن طعن سبھی کچھ شروع ہوگیا، اب ایک طبقہ کا سوال ہے کہ اردوغان فوراً اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ کیوں نہیں کرتا؟ دوسرا طبقہ کیا اس کے جواب میں یہ کہنا پسند کرے گا کہ اردوغان کو اب بھی اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے تھا، خاموشی سے کام کرتے رہتے! آخر پھر ایسے کام سے کیا فائدہ؟ سمجھنا یہ چاہیے کہ اسلام کا نام جب بھی لیا جائے گا، اسلام دشمن حرکت میں آجائیں گے، کیوں کہ ان کی دشمنی اسلام کی قوت وشوکت، اسلام کی خودمختاری اور اسلامی نظام سے ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ مسلّم اصول ہے کہ ہر رات کے بعد دن ہوتا ہے، تنگی کے بعد کشادگی ہوتی ہے، رونے کے بعد ہنسی بھی آتی ہے، غموں کے بعد خوشیاں بھی مقدر بنتی ہیں، تاریکیوں کی کوکھ سے روشنی پھوٹتی ہے، پوری تاریخ میں کبھی کوئی انقلاب اور کوئی بڑی تبدیلی بغیر جان ومال کی قربانی کے نہیں آئی، تبدیلی کا عمل جب بھی ہوگا دشمن یوں ہی قتل وغارت کا بازار گرم کرے گا، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، لہذا یہ سوچ کر تبدیلی کے عمل سے دستبرداری ممکن نہیں، البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تبدیلی کے نام پر اسلام کو بدنام کرنے والی مسلح کوششوں کو قطعی درست نہیں قرار دیا جاسکتا، ان کے پیچھے دراصل مغربی طاقتیں اوران کی پٹھو ڈکٹیٹر حکومتیں ہوتی ہیں جو اسلام پسندوں کو ختم کرنے کا جواز تلاش کرنے کے لئے اپنی ناجائز اولادوں کو میدان میں اتارتی ہیں اور پھر دہشت گردی کے مقابلہ کے پرکشش عنوان سے مسلمانوں کے سب سے اعلی دماغ اور اعلی طبقہ اور دیندار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔

جب باطل دندناتا ہے اور اہل حق اسے دندنانے کی اجازت دیتے ہیں، تو پھر اس کی زد میں سبھی آتے ہیں، مصالح کے

نام پر لوگ خاموش رہے، وہ اسلام دشمنی کی اس مہم کو اخوان دشمنی سمجھتے رہے، تا آنکہ ایسی ایسی شخصیات کا نام زد میں آنے لگا اور ایسی ایسی تنظیمیں زد میں آنے لگیں جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ابھی گزشتہ ماہ ایک اعلان دیکھا جس میں سعودیہ کی ایک یونیورسٹی میں طلبہ کو مقالہ نگاری کے مسابقہ میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی، جس کا مرکزی عنوان تھا ''منہج اہل سنت و جماعت سے ہٹی ہوئی معاصر تحریکات'' نیچے چار تحریکوں کے نام تھے، اول الذکر دو ناموں کے اہل سنت والجماعت کے منہج سے ہٹے ہونے بلکہ ان کے اسلام دشمن اور اسلام مخالف ہونے پر سب کا اتفاق ہے، وہ دونوں جماعتیں القاعدہ و داعش تھیں، لیکن ان کے ساتھ اخوان اور جماعت تبلیغ کا ذکر بھی انصاف کے نام پر کلنک ہے، مگر سعودیہ نے یہ کام کیا، دعوت وتبلیغ کا تو تعلیمی رفاہی سماجی کسی قسم کا کوئی کام نہیں ہے، معاشرہ اور معاشرے کے اونچ نیچ سے بھی کوئی رشتہ نہیں ہے، سیاست وغیرہ تو تقریباً وہاں شجر ممنوعہ ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کو بھی اسی کے ساتھ رکھا گیا، اس سے سعودیہ کے خطرناک عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، رواں ماہ میں مکہ اور جدہ اور ان کے اطراف میں ایک پروگرام مختلف مساجد میں رکھا گیا، اس پروگرام کو "برنامج لحمة الوطن" کا نام دیا گیا، یعنی وطن کو مضبوط کرنے والا پروگرام، اس کے تحت جن عناوین پر محاضرات ہوئے وہ سب فساد وتخریب اور اخوان دشمنی پر مبنی تھے، اس کے عناوین کچھ یوں تھے ''نوجوانوں کو برباد کرنے کے اخوانی طریقے'' ''اہل سنت والجماعت اور دہشت گرد اخوان کے اصولوں میں فرق''، ''اخوان کی طرف نسبت کرنے کے خطرات'' اور کچھ دیگر عناوین کے بعد سب سے بدترین اور پرفریب عنوان یوں تھا ''امن و سلامتی کے قیام میں دعوت وصحیح عقیدہ کا کردار ___ مملکت سعودیہ کے نمونہ کی روشنی میں''، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سعودی حکومت کسی سطح کی اسلام دشمنی پر آمادہ ہے، ایک سے بڑھ کر ایک علامہ وقت کو قید و بند میں ڈال کر، ہزاروں علماء کو قتل کر کے لاکھوں لوگوں کو بے روزگار کر کے، ناحق طریقہ پر امت کا مال، شہریوں کی دولت ہڑپ کر کے ٹرمپ کو ''جزیہ'' ادا کر کے، اسرائیل سے کھلے ہوئے تعلقات قائم کر کے، حجاج کی سیکورٹی یہودیوں کو دے کے، سفارت خانہ کو مقتل بنا کے بھی، وہ امن کا علمبردار ہے، بس اب کیا کہا جا سکتا ہے سوائے اس کے فیا موت زر إن الحياة ذميمة.

خبریں تو یہاں تک ہیں کہ سعودی حکومت نے ہندوستان کے کسی طبقہ کو ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ پورے ملک میں پروگرام کریں اور اخوان کا ''خونخوار و دہشت گرد'' چہرہ دکھائیں، پاکستان میں تقریباً اس کی ابتدا ہو چکی ہے، حکمراں جماعت کی خاتون رکن پارلیمان نے جس طرح اپنی تقریر میں یہود دوستی کا دم بھرنے کی صدا لگائی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر میں مغرب اور اس کے غلام سعودی عرب نے اپنے ہرکاروں کو احکامات دے دیے ہیں، ظاہر ہے کہ سعودی کے تعاون کی قیمت تو چکانی پڑے گی، پاکستان کو معاشی بحران سے نکالنے میں سعودیہ کا ہمیشہ تعاون رہا ہے، نئی حکومت کے ساتھ بھی مزید معاونت کے عہد کی تجدید ہو چکی ہے، اس کی تقریر میں عربوں کی نئی پالیسی کے اثرات جھلک رہے تھے، عمان، امارات سعودیہ و بحرین کی نئی پالیسیاں دیکھیے اور اس خاتون کا یہ بیان دیکھیے کہ ہم کو اب ''یہودیوں سے دوستی کر لینا چاہیے اس سے امن مل سکتا ہے''، اس نے تو مسجد اقصی پر یہودیوں کا حق بھی تسلیم کر لیا اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ قرآن سے ثابت ہے، مزید اپنی جہالت یوں منظر عام پر لائی کہ ''حضرت محمد بھی

بنی اسرائیل سے تھے''، ''نبیؐ نے یہودیوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے ساتھ مل کر کام کیا ہے''، یہ اور اس طرح کی بے شمار ہفوات اس کی تقریر کا حصہ تھیں، ظالم نے ''مولانا لوگوں'' سے یہ بھی درخواست کی ہے کہ ''مولانا لوگ پلیز قرآن سے کوئی آیت تلاش کرلائیں جس سے مسلمانوں اور یہود ونصاریٰ میں دوستی ہوسکتی ہو''۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم دنیا کو دیکھیں اور سمجھیں، ہم مغرب کے تیور اور عربوں کی سیاست سے واقف ہو کر حق کو حق اور باطل کو باطل کہیں، کیا وقت نہیں آیا ہے کہ ہم ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ابوالحسن علی ندوی کی طرح سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہیں، اخوانیوں نے وہ جہاں بھی رہے ہندوستانی علماء کی قدر کی، ان کی کتابوں اور ان کی فکروں کو عام کیا، ہندوستانی علماء اگر ضرورت ہو تو ان پر تنقید کرنے کے ساتھ ان کا اصل چہرہ اور ان کی اصل فکر پیش کریں، ان کا جائز دفاع کریں، یاد رکھیے اگر آج ہم پیچھے ہٹتے چلے گئے اور دوسرے پر کریک ڈاؤن کو ہم یوں ہی دیکھتے رہے تو کل تاریخ یہی سبق ہمارے ساتھ دوہرائے گی، ہماری حکومت کے تیور بہت اچھے تو نہیں، اور دستور کا نعرہ بھی فضول ہے، اس خطرہ سے نمٹنے کی کوئی تیاری بھی نہیں جو ۲۰۱۹ء کے بعد نظر آرہا ہے، وہ خطرہ ہے آئین میں ترمیم کا، جس کے ابتدائی مناظر اس حکومت کے دوران دکھائے گئے ہیں اور ہم منہ تکتے رہے ہیں، گلے پھاڑتے رہے ہیں، مگر نتیجہ صفر رہا، کیوں کہ جس کے پاس منصوبے نہیں ہوتے، زمینی محنت نہیں ہوتی، جو قوم کسی ایک نکتہ پر متحد نہیں ہوتی، جس قوم کا دماغ جمود کا شکار ہوجاتا ہے، اس کا نہ کوئی احتجاج مؤثر ہوتا ہے، اور نہ کوئی اس کے ماتم پر کان دھرتا ہے، ابھی بھی وقت زعماء وعمائدین وقت ہے کہ کی نزاکت وضرورت کو سمجھیں اور لائحہ عمل تیار کریں، جماعتیں اور تنظیمیں مفادات سے بالا ہوکر سچ کا ساتھ دیں اور حکومتی مظالم، دھاندلیوں اور غلط پالیسیوں کی برسرِ عام مخالفت کو اپنا شیوہ بنائیں، ورنہ آج وہ کل ہماری باری ہے، اس ملک میں ہم اور ہمارے ادارے محفوظ نہیں بلکہ بارود کے ڈھیر پر ہیں، اس ملک کی اسلام دشمن طاقتوں کو عالمی اسلام دشمن طاقتوں سے یارانہ ہے، مگر ہم تو سب کچھ ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور اپنی مجلسوں میں کفِ افسوس مل لینے کو کافی سمجھتے ہیں، ہمارے انتشار کا یہ عالم ہے کہ ایک تبلیغی جماعت جو بہت سادہ سی جماعت جماعت تھی، اور سادے سے اصولوں پر چلتی تھی، وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور مسجد مسجد انتشار ہونے لگا، کیا اس ملک کے اکابر سر جوڑ کے بیٹھ جاتے اور فریقین کو کسی ایک معتدل نکتہ پر متفق کرتے تو یہ انتشار ختم نہ ہوتا، مگر افسوس کہ اس انتشار کو ختم کرنے کی جیسی مضبوط کوشش ہونا چاہیے وہ نہیں ہوئی، کوئی ایک فریق کے ساتھ ہوگیا کوئی دوسرے فریق کے ساتھ، کیا تاریخ ہمیں معاف کرسکے گی، کیا اس طرح کے انتشار کا خمیازہ اس قوم کو بھگتنا نہیں پڑے گا، فقط بیان بازیاں ہیں، بے وقت کی شہنائیاں ہیں، فتوے ہیں، سوشل میڈیائی بیانات اور اظہار مواقف ہیں، کوئی ٹھوس پالیسی اور ٹھوس اقدام نہیں جو اس امت کی کشتی کو موجوں کے انتشار کی نذر ہونے سے بچا کر ساحل سے ہمکنار کرسکے۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

خاص تحریر

سعودی عرب کے حکمرانوں سے کچھ صاف صاف باتیں

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

ڈاکٹر سَفر الحوالی

ترجمہ: محمد اعظم ندوی

نوٹ: مشہور اسلامی مفکر اور حق گو مصنف ڈاکٹر سفر بن عبدالرحمٰن آل غائم الحوالی (پ: ۱۹۵۵ء) باحہ (سعودی عرب) کے رہنے والے ہیں، ایک عرصہ تک جامعہ ام القری مکہ مکرمہ میں شعبۂ عقیدہ وادیان معاصرہ کے صدر رہے، سعودی عرب میں پچھلے پچیس سالوں سے بیداری مہم میں مصروف ہیں، اور سعودی عرب کی امریکہ اور اسرائیل سے قربت اور اس کی دیگر غیر اسلامی پالیسیوں کے سخت ناقد ہیں، دنیا بھر میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں، The Clash Of Civilisations کے مصنف صموئیل ہنٹنگٹن نے بھی اپنی بعض تحریروں میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ان کی اسی حق گوئی پر اس سے پہلے نوے کی دہائی میں ان کو پابہ زنجیر کیا گیا، حال ہی میں ان کی ایک انقلابی کتاب ''المسلمون والحضارۃ الغربیۃ'' (مسلمان اور مغربی تہذیب) جب انٹرنٹ پر عام ہوئی جس کے صفحات ۳۰۰۰ سے متجاوز ہیں، تو ان کو ایک بار پھر ان کے بچوں سمیت گرفتار کیا گیا، ذیل میں اس کتاب کے صرف ایک باب ''تیسری نصیحت آل سعود کے لیے'' کا خلاصہ اردو قالب میں پیش کیا جاتا ہے۔

آل سعود سے میرا تعلق سرسری نہیں، بلکہ ان سے میرے گہرے روابط رہے ہیں، شاہ سلمان سے ان کی تاج پوشی سے قبل میری متعدد ملاقاتیں رہی ہیں، وزیر داخلہ امیر نائف پھر محمد بن نائف اور بھی کئی امراء کے ساتھ بارہا میری گفت وشنید ہوئی ہے۔

بہت سے لوگوں کا مجھ پر احسان ہے، جن کا میں شکر گذار ہوں، خاص طور سے آل سعود کا، جنہوں نے مجھے میرے عہدے سے سبکدوش کر کے ہر طرح کے حق سے محروم کر دیا، اور مجھے ''مردِ حر'' بنا دیا، آج اگر میں نصیحت کر رہا ہوں تو میرے منہ میں ایک گھونٹ پانی بھی حکومت کا نہیں جو مجھے نصیحت سے روک سکے۔

میں کسی فرد بشر کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوں، چونکہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے، اس نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو بنی امیہ کے درمیان سے کھڑا کیا، اور متوکل کو عباسیوں سے پیدا کیا، اور کسی کی تحریروں کا پڑھنا اس کی ہر رطب ویابس مان لینے کی دلیل نہیں، میں معاصر علماء میں سب سے زیادہ شیخ ابن باز سے اور ماضی کے علماء میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے متاثر ہوا، بایں ہمہ حق مجھے ان سے زیادہ عزیز ہے، نہ میں ان کی تقلید کرتا ہوں نہ کسی طالب علم کو ان کی تقلید کی نصیحت کرتا ہوں۔

وحی کتاب وسنت کے بعد میری سب سے پسندیدہ کتاب ذہبی کی ''سیر أعلام النبلاء'' ہے، لیکن اس پر بھی میری کچھ تنقیدیں ہیں، ہوسکتا ہے میں ان میں غلطی پر ہوں، مقصد یہ ہے کہ میری رائے میں ایک طالب علم کو اپنی رائے اور موقف کی تعیین میں آزاد ہونا چاہئے، اور پوری امت اور انسانیت کے حق میں خیر خواہ ہونا چاہئے، ان کو راہ دکھانا اس کا فرض منصبی ہے۔

مجھے آل سعود سے اختلاف ہے، لیکن میں اللہ کے حکم کے مطابق ان کا بہی خواہ ہوں اور ان کے حق میں منصفانہ باتیں کرنا چاہتا ہوں، ان کے بارے میں میں صرف اور صرف حق بولتا ہوں، ان کے ساتھ فریب کرنے والوں یا ان کے نسب پر طعن کرنے والوں اور خاندان پر کیچڑ اچھالنے والوں سے مجھے اتفاق نہیں، اور اس نصیحت پر میں ان سے کسی اجرت یا منصب یا کسی اور مادی شے کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ وہ میڈیا میں کہیں میرا نام

بھی نہیں لیں گے، کچھ باتیں ان کی ذاتیات سے متعلق ہیں، ان سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، نہ ان پر ایسی عیب گیری جس سے وہ بری ہوں، امام احمد سے ایک شخص کے بارے میں رائے مانگی گئی، انہوں نے کہا: " لا نسبّــه و لا نحبّـه " (نہ ہم اسے عار دیتے ہیں نہ اس سے پیار کرتے ہیں)۔

سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس زبان کے سوا کوئی طاقت نہیں، اس لیے میں کہنے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا، اور بات ایسی ہے کہ وہ نہ کہوں تو گویا مجھ میں کوئی خیر نہیں، اور زبان ہی سے بوسیدہ تخت وتاج کے مالک اور کرم خوردہ کرسیوں پر براجمان ہونے والے خوف کھاتے ہیں، قسم کھا سکتا ہوں کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے، لیکن میں اپنے ظالم پر ظلم کرنا نہیں جانتا، ابھی اس کا دور شباب ہے، ابھی کیا حساب وکتاب ہے، اس کا حساب آخرت پر چھوڑ رکھا ہے، اس نصیحت میں سختیاں بھی ہوں گی تلخیاں بھی ہوں گی، لیکن ان کی پروا اس لیے نہیں کہ جو کچھ ہے سب اللہ کی رضا کے لیے ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

میرا مقصد صرف منکر کا انکار ہے، میں سیاسی حریف یا حلیف نہیں جیسا کہ مجھ پر الزام ہے، نہ میں یہ ملک چھوڑنا چاہتا ہوں خواہ مجھے کتنی ہی اذیتوں کا سامنا ہو، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے صبر کی ہمت دے، نہ میں ان نفوس قدسیہ سے افضل ہوں جن کو آروں سے چیرا گیا، جن کے جسم پر آہنی کنگھیاں پھیر دی گئیں، ہاں مگر عزیمت پر قائم ہوں، اور ہر قدرت رکھنے والے کو اس کی نصیحت کرتا ہوں، جو رخصت پر عمل کرے اس کو میں برا نہیں سمجھتا، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ہمیشہ حق پر ثابت قدم رکھے، اور نفس وشیطان کے خلاف میری مدد فرمائے۔

اے آل سعود! جب میں یا مجھ جیسا کوئی اور تمہیں اصلاح کی دعوت دیتا ہے، اور ہم یہ بتاتے ہیں کہ کیوں کر اصلاح ہوسکتی ہے، تو ہم صفر سے چلنے کو نہیں کہتے، نہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی اور تجربہ کلی طور پر اڈاپٹ کرلیا جائے یا اصلاح کا کوئی بنایا بنایا فارمولہ امپورٹ کرلیا جائے، بلکہ ہم اس تجربہ کی دعوت دیتے ہیں جو ہمارا خود کا تجربہ ہے، اور اس کو زیادہ دن نہیں گذرے، اور جسے آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں، صرف بعض منفی چیزوں کی اصلاح کرنی ہے، خاص طور سے بعض حضرات - اللہ مغفرت کرے - کا یہ فتوی دینا کہ گھڑی پہننا حرام، اور ٹیلی گرام کا استعمال حرام ہے، خوبصورت قسم کی گنڈیاں حرام ہیں، ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ چلیں، اور اس کی مثبت اور مفید چیزوں کو اختیار کریں۔

اس مبارک جزیرہ کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے، اور اس کی برکتیں کبھی کم نہیں ہوں گی، غیر ملکی قوتیں اس کے لیے کتنا ہی زور لگالیں، یہاں کے عوام نہیں اٹھ کھڑے ہوں گے تو یہ جزیرہ خود اٹھ کھڑا ہوگا، اس کے سانپ بچھوان کو ڈس لیں گے، اس کی ریت کے صحراؤں میں ان کے طیارے گم ہوجائیں گے، اللہ ان پر ہلاکت خیز ہوائیں بھیج دے گا، ان میں ایسا مرض پھیل جائے گا جس کی تشخیص میں اطباء سر پھوڑ لیں گے، اس سے پہلے کی جنگوں میں ایسا ہوا، ایک بیماری کا نام ہی "متلازمۃ حرب الخلیج" (Gulf War Syndrome) ہے جس سے دوسری جنگ خلیج کے فوجی دوچار ہوئے، اور سعودی جریدہ "الریاض" نے واضح کیا کہ یہ صرف ایک مرض نہیں کئی نامعلوم امراض کا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالی نے اس کو گرم صحراؤں سے گھیر دیا ہے، اور خنزیروں سے محفوظ کردیا ہے، اگر نپولین اور ہٹلر کا روس کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ جنرل "ٹھنڈک" نے وہاں شکست دی، تو ہم کہتے ہیں کہ اس جزیرہ کو جنرل "صحراء" نے فارس وروم کی فوج کشی سے محفوظ رکھا۔

ہر حاکم کے لیے ضروری ہے کہ شرعی امامت کے سلسلہ میں جو نصوص وارد ہوئی ہیں ان کو روبہ عمل لائے، امام وقت کا نماز وروزہ اور حج کا پابند ہونا یہ معاملہ اس کے اور اس کے رب کے مابین ہے، اس سے مجھے سروکار نہیں، لوگوں کو دو باتوں کی فکر ہوتی ہے: عدل اور امن جبکہ یہ دونوں اسلامی مفہوم کے مطابق ہوں، اور یہ اس وقت

تک ممکن نہیں جب تک کہ شورائی نظام نہ قائم ہو، اور سماجی معاہدہ شرعی بیعت کی شکل میں ہو، فکری، غذائی اور سماجی امن لوگوں میں عام ہو، اور انہیں دو بنیادوں پر ہماری نصیحتوں کا دارومدار ہوگا۔

یہ ملک- جس پر حکمرانی کا موقع دے کر اللہ تعالی نے آل سعود کو آزمایا ہے- بڑی خصوصیات وامتیازات کا حامل ہے، مجھے اس سے ایسی محبت ہے جیسے حضور ﷺ کو مکہ سے تھی، مجھے امید ہے کہ یہی ملک اس خلافت کا گہوارہ بنے گا جس کے جھنڈے تلے تمام مسلمان جمع ہو جائیں گے۔

میں نے عوام الناس کے لیے لکھا ہے، صرف آل سعود کے لیے نہیں، میرے لیے یا کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ آل سعود کے بارے میں ہی نہیں کسی یہودی یا عیسائی کے بارے میں بھی کوئی جھوٹی بات نقل کرے، یا نیتوں اور مقاصد کی کھود کرید کرے، اللہ ہی انہیں جاننے والا، اور ان سے مطلع ہے، کسی انسان پر ظلم جائز نہیں، خواہ وہ کوئی بھی ہو، جعفر الحائک کو قتل کیا گیا جسے تڑپا تڑپا کر مرنے پر مجبور کیا گیا تو دنیا نے دیکھا میرا موقف کیا تھا، میں نے محکمۂ تحقیق کے منتظم اعلی تک اپنی بات پہنچائی اور اس پر نکیر کی جبکہ- جیسا کہ مشہور ہوا- وہ ایک شیعہ تھا۔

میں حکمراں خاندان سے یہ فریاد نہیں کرتا کہ بالکل اہل علم اور دیندار طبقہ کو پا بہ زنجیر ہی نہ کریں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو عدالتوں میں زانی، مے نوش، اور نشہ خور افراد کے برابر کر دیں لیکن اگر ان مجرموں کی رہائی ہوسکتی ہو تو ان علماء دین کی بھی ہونی چاہئے۔

جب ہم جیل میں تھے تو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ عید کے دن قیدیوں کو تخفیف دی جائے گی، اور ان کو چھوڑا جائے گا، لیکن جیلر نے ہمیں بتایا کہ یہ حکم ہمارے لیے نہیں ہے۔

یہ اللہ کی سنت ہے کہ افتراء پردازی کرنے والے لوگ جب علماء پر طلب حکمرانی کا الزام نہیں دے پاتے تو ان پر کوئی اور تہمت لگا دیتے ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے خرق اجماع کیا، شیخ محمد بن عبدالوہاب کو یہ الزام دیا کہ وہ خارجی ہیں، شیخ محمد بن ابراہیم پر یہ کہ وہ خود کو مفتی اعظم کا لقب دیتے ہیں، جبکہ مفتی اکبر اللہ کی ذات ہے، شیخ ابن باز پر یہ تہمت کہ رسول اللہ ﷺ کو ناپسند کرتے ہیں، شیخ محمد صالح عثیمین پر یہ کہ وہ حلول کے قائل ہیں۔

اور میں جو اُن صالحین اخیار سے نہایت فروتر ہوں ان الزامات سے نہیں بچ سکا، ایک انسکپٹر نے یہاں تک مشورہ دیا کہ میرے بینک کھاتہ میں ایک خطیر رقم رکھ دی جائے اور کہا جائے کہ یہ پیسے ایران نے سفر الحوالی کو بھیجے ہیں، اور پھر غداری کا مقدمہ چلایا جائے۔

مجھے ان باتوں کی پروا نہیں، میں امریکہ اور اسرائیل سے اللہ واسطے دشمنی رکھتا ہوں، اور تا زندگی اس پر قائم رہوں گا، اور اس راستہ میں ہر آزمائش کا سامنے کرنے کے لیے تیار ہوں، خواہ مجھے قتل کر دیا جائے، کبھی میرے دل میں خیال بھی نہیں گذرا کہ میں بلاد حرمین کے ساتھ- معاذ اللہ- کوئی خیانت کروں گا۔

اے آل سعود! میں تمہیں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی نصیحت کر رہا ہوں، جبکہ میں جانتا ہوں کہ بعض لوگ آپ لوگوں کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں، اور آپ میں سے بعض فریب کھا چکے ہیں، لیکن مجھے آپ کی عقلوں پر بھروسہ ہے کہ آپ خیر خواہ اور فریبی کو پہچاننے میں فرق کرتے ہیں۔

میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ ایک نسل گذر گئی اور علما صرف ایمان کے چند مظاہر پر بات کر رہے ہیں، سگریٹ نوشی، داڑھی بڑھانے اور چمچہ سے کھانے جیسے مسائل ہی ان کے زیر بحث رہے، پھر ایک نسل آئی جس نے غیر ملکی زبانوں میں مہارت حاصل کی، اور وضعی نظریات وقوانین سے ان کو واقفیت ہوئی، اور ایسے علوم میں اختصاص کیا جن پر پہلے صرف اللہ کے دشمنوں کو اجارہ داری حاصل تھی؛ بلکہ ان میں بعض تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان ملکوں میں اعلی ڈگریاں حاصل کیں، اور وہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے،

اور وہاں کے لوگوں سے بھی فائق ہوئے۔

اور خدا کا شکر ہے کہ یہ نسل بایں ہمہ اپنے دین پر قائم اور اسی کی دامن گرفتہ ہے، مغربی تہذیب کو جان اور سمجھ کر اور اس کے معاشروں میں رہ کر اس پر حاوی ہے، اس سے مغلوب نہیں ہے؛ لیکن لبرل اور بے دین لوگ آج بھی پچھڑے ہوئے ہیں، الحمدللہ ہم عالمی بازاروں میں کوئی گدا گر قوم نہیں، ہماری تاریخ اور تجربات ایسے ہیں جن میں ہمارا کوئی ہم سر نہیں، اگر غور کریں تو کسی اور مستعار فکر و تہذیب کی نقل اتارنے کی ہمیں ضرورت ہی نہیں، جو ہمارے پاس ہے بہت کافی ہے۔

اور مجھے امید ہے کہ آپ ان عوام کی نرمی سے دھوکہ میں نہیں رہیں گے، اور یہ نہ سمجھیں گے کہ خاموشی رضامندی ہے، زیادہ تر یہ خاموشی صبر یا مجبوری کی وجہ سے ہے، لوگ ہتھکڑیوں اور زنجیروں سے ڈرتے ہیں، جب کہ حق گوئی موت کو قریب یا دور نہیں کرتی، موت اپنے وقت پر ہی آئے گی۔

اے آل سعود تمہارا معاملہ بالکل جداگانہ ہے، تم قریش میں سے نہیں جن کو نص کے مطابق حکومت کا زیادہ حق اور اختیار ہوگا، اور نہ ہی حمیر کے ہو کہ فساد زمانہ کے وقت جن کے پاس حکومت چلی آئے گی، یہ حکومت تو غلبہ اور مجبوری کی حکومت ہے، اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ سعودی عرب کی موجودہ سیاسی پالیسیوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے، تمہیں جو دولت عطا کی گئی ہے وہ اب تک ضائع ہو رہی ہے؛ بلکہ یہ کہوں تو غلو نہ ہوگا کہ تمہارے خلاف استعمال ہو رہی ہے، لیکن افسوس کہ عوام ہر طرح کی مصیبت صرف دین وعقیدہ کے لیے برداشت کر رہے ہیں۔

وہ اربوں ڈالر جن پر سیسی نے قبضہ کیا اس کو بشار کی تائید سے نہیں روک سکے، وہ آج تک عرب اتحاد میں شامل نہ ہوا؛ بلکہ اس سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس نے حوثیوں کی ہتھیاروں سے مدد کی، یہ بھی ثابت ہو گیا، یہی حال لبنانی فوج کے ساتھ ہوا جن پر شیعہ حزب اللہ غالب ہے، اور تم مستقبل کی لہروں کا رخ پھیرنے کے لیے مسلسل گھاٹے کا سودا کرتے جا رہے ہو، خلیج میں بھی تمہاری ایسی ہی صورتحال ہے، جس نے قطر، کویت اور عمان کو ایران کی گود میں ڈال دیا، اس وقت ایران کی اہم بندرگاہ دبئی بن گیا، گویا تم ایرانی سیاست کی تائید کر رہے ہو اور اس کے لیے ہدیے پیش کر رہے ہو، خاص طور سے اس کی اسرائیل نوازی کی کوشش میں اس کا ساتھ دیا جا رہا ہے؛ حالانکہ اس کا اور اس کے حلیفوں کا جھوٹا نعرہ ہے: "**الموت لاسرائیل و النصر للاسلام**" (اسرائیل کے لیے موت اور اسلام کے لیے نصرت) اس لیے کروڑوں مسلمان اس کو سچا مان رہے ہیں۔

ایسے ہی داخلی سیاست میں بھی تمہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو نصیحت کر سکے اور تمہارا بہی خواہ ہو، ورنہ اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ کہیں میری آنکھوں کے سامنے اور "**هيئة كبار العلماء**" اور تمہارے روبرو عوام کی خاموشی کا باندھ ٹوٹ پڑے۔

یہ بات ہرگز نہ بھولیں کہ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اور صبر کرنے والا بھی ایک مرحلہ میں پھٹ پڑنے کو تیار ہوتا ہے، کتنے ہی صبر کرنے والے ایسے ہیں جن کے اندر اندر غصہ کا لاوا پک رہا ہوتا ہے، آپ کے بہت سے محبت کرنے والے مقربین کا حال یہ ہے کہ اگر ان کی ایک مہینہ کی تنخواہ روک دی جائے تو ان کا اصل چہرہ سامنے آجائے، ان کا مقصد صرف اور صرف ادنی مادی فوائد کا حصول ہے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ بھی ہرگز نہ بھولیں کہ لبرل افراد بہ ظاہر آپ سے بعض چیزوں میں جتنا بھی اتفاق کر لیں وہ دوسرے مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں، جیسا کہ آپ نے امارات کے ساتھ اتحاد کر لیا جبکہ "ہادی" کا کہنا ہے کہ وہ ایک مقبوضہ حکومت ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ ان کے مقاصد آپ سے کتنے مختلف ہیں۔

تم نے محمد جلال کشک کو سات ملین دے دیا، آج اس کی مالیت اس سے بھی زیادہ ہے، کیوں دیئے؟ تاکہ وہ سعودی سسٹم کا شرعی جواز فراہم کرے اور اس کو تم نے کھلی چھوٹ دی کہ جس سے چاہے

اور جو چاہے سوال کرے؛ جبکہ وہ سرکاری اعلان کے مطابق اجنبی ہے، سعودی شہری نہیں۔

ایک ایسے وقت میں تمہیں یہ نصیحت لکھ رہا ہوں جبکہ تم ایک بڑے معاشرتی انقلاب اور جدید سعودی مملکت کے قیام کے لیے تیار ہو جیسا کہ احمد بن عثمان تویجری نے کہا تھا، تبدیلی اور انقلاب ضروری ہے، یہ اللہ کی سنت ہے؛ لیکن کاش یہ خوب سے خوب تر کی طرف ہو نہ کہ خوب سے ناخوب کی طرف۔

سعودی عرب اس وقت دوراہے پر ہے، یا تو اسلامی نظام پر قائم رہے جس کا لازمی نتیجہ اس بات کا صاف انکار ہے کہ سعودی ایک سیکولر ملک ہے، اور میں اسی کی نصیحت کرتا ہوں، دوسرے یہ کہ سعودی عرب سیکولر اسٹیٹ میں تبدیل ہو جائے، امریکہ، اسرائیل، اور امارات کو اس پر راضی کرنے میں لگا رہے، یا تو ایمان کا خیمہ بنا رہے یا نفاق کا کیمپ بن جائے، خدانخواستہ داخلی سیاست میں اگر آخر الذکر کو ختیار کیا گیا تو اسلام اسی طرح کھرچ کر پھینک دیا جائیگا جیسا کہ خارجی سیاست میں ہوا، اللہ کے غضب، عوام کے غصہ اور اس کے ردعمل سے ڈرنا ضروری ہے۔

آزادی کا مفہوم یہ نہیں کہ ارتداد کا راستہ کھول دیا جائے۔ جو اپنا دین بدل دے اس کی سزا قتل، جو گستاخ رسول ہو اس کی سزا بھی اس سے کم نہ ہو، جو صحابہ کے ساتھ دشنام طرازی کرے اس کی بھی تعزیر کی جائے۔

معاشی ترقی مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، اپنی معاشرتی ترجیحات کے تحفظ کے ساتھ اقتصادی ترقی ضروری ہے، اور یہ دونوں کوئی متضاد نہیں، اور معاشی ترقی کچھ کام کی نہیں اگر محکمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنا کام چھوڑ دے، علما اور دانشور موجود ہیں؛ لیکن عالمی پیمانہ پر سوشل میڈیا وغیرہ کی برائیاں کہاں سے کہاں تک پہونچ گئیں؛ لیکن اس سلسلہ میں کوئی بے چینی نہیں، کوئی قانون سازی نہیں۔

صرف ایک فیصلہ ملک کی سیکولر آبادی کی مرضی پر ہو رہا ہے، ملک کی تشکیل، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ مسئلہ صرف سیاحت اور تفریح کی چھوٹ کا نہیں، مسئلہ شیخ عبدالوھاب والی توحید کی تعریف کو بدلنے کا بھی نہیں ہے، بلکہ معاملہ دین اور لادینیت کی کشمکش کا ہے؛ بلکہ توحید اور شرک کی کشمکش کا ہے۔

اے آل سعود! تمہارا خاندان اصلاً دین دار اور عام عرف میں مطوع ہے، تمہارے قانون کا مرجع دین ہے، لادینیت نہیں، اس لیے خود کو خدا کے دشمنوں کی راہ پر نہ ڈالو، تم سب یا تمہارے علاوہ جس سے بھی غلطی ہو جائے اس کو دین کی روشنی میں سمجھا ناممکن ہے، دین سے جنگ کر کے نہیں، مثلا:

.1 امیر خالد بن مساعد کو قتل کے بغیر سمجھانا ممکن تھا، یہ کہنا غلط ہے کہ اسے ریاض پولیس کے چیف ابن بلال نے قتل کیا، خاندان آل سعود کے کسی فرد کو کوئی پولیس والا خود سے ہاتھ لگا دے یہ ناممکن ہے۔

.2 امیر ممدوح بن عبدالعزیز ایک دین دار نوجوان تھا، برائیوں پر روک ٹوک اس کا مزاج تھا، اس کو تم نے ملک بدر کر دیا، پھر اس کی برین واشنگ کی اور اسے غلط راستہ پر ڈال دیا، معلوم نہیں اب اس کا کیا حال ہے۔

نفاق سے بچو، خواہشات اور سیاسی مفاد کی پوجا مت کرو، قرآن نے سورہ منافقون میں یہ صاف اعلان کر دیا کہ منافقین بھی زبان سے وہی کہتے ہیں جو حق ہے، اطاعت کے شرک سے بچو، جس سے امام ابن تیمیہ نے آگاہ کیا تھا، اطاعت کا شرک کھلی نافرمانی اور اعراض ہے، منہ موڑنے اور جھٹلانے میں کوئی فرق نہیں، کیا یہ خواہشات کی اتباع نہیں ہے کہ بعض علما کے فتوے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے لیے جاتے ہیں، مثلا:

.1 تم نے ملک سعود کو ہٹانا چاہا تو علما کا سہارا لیا۔

.2 جب امریکی افواج سعودی عرب میں آئیں تو تم نے یہی کیا، علماء نے ان کے اس سرزمین پر قدم رکھنے اور قدم جمانے کے بعد فتوی دیا۔

.3 جب تم نے اپنے مخالفین کو پابہ زنجیر کرنا چاہا اس وقت بھی یہی کہا کہ: ہم علماء کے فتوی پر عمل کر رہے ہیں؛ جب کہ انہوں نے کبھی جیل کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

.4 آج معاملات کے صیغہ میں سعودی فتوی کمیٹی کا کوئی بڑا عالم نہیں، علماء ہمیشہ سے پہلے بھی اور آج بھی ربا کے حرام ہونے کا فتوی دے رہے ہیں؛ لیکن یہاں کے معاملات ربا آمیز ہیں۔

میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ فساد کو اصلاح کا نام مت دو، اس کا ایک حصہ مستقل سعودی خواتین کی پاک دامنی سے چھیڑ چھاڑ ہے، ان کو اسٹیڈیم میں داخلہ کی اجازت ہے، اس کا ایک فائدہ کپڑے کی کمپنی کو ہو رہا ہے کہ جو خاتون جس ٹیم کو سپورٹ کرتی ہے، اسی کے رنگ اور انداز کے کپڑے خرید کے اور پہن کے اسٹیڈیم میں آتی ہے، اور اس طرح یہ کاروبار چمک رہا ہے، اس پر سعودی فتوی کمیٹی خاموش ہے، چلئے خاموشی تائید سے بہتر ہے اور یہ کہنے سے بہتر ہے جیسا کہ پہلے کہہ رہی تھی کہ ولی امر زیادہ مصلحتوں سے واقف ہے۔

اللہ تعالی ہمیں دعاء براہیمی کی بدولت حج اور عمرہ کے ذریعہ بے حساب دولت عطا کر رہا ہے اور ہم سیاحوں کو راغب کرنے والے خیالی منصوبے اور پروجیکٹ میں لگے ہوئے ہیں، کیا یہ بے بصارتی اور بے بصیرتی نہیں، کیا یہ اعلی کا سودا ادنی سے نہیں، ملت ابراہیمی سے مت ہٹو کہ اس سے بڑا نادان کوئی نہیں، "**ومن یرغب عن ملة ابراهیم الا من سفه نفسه**"۔

مغرب نواز افراد کہیں گے کہ سعودی عرب جب انقلاب کی جانب گامزن ہوا تو ہماری احمقانہ آوازیں اس کو پیچھے دھکیلنا چاہتی ہیں، انقلاب ضروری ہے لیکن اپنی ترجیحات کا خون کر کے جو تبدیلی بھی آئے گی وہ موت کا پیغام ہے، ہم وہ قوم ہیں جس کی کچھ خصوصیات ہیں، ہم تحلیل ہو جانے والے لوگ نہیں، ہمارے پاس حرمین ہے، ایسی دولت مشرق ومغرب میں کہاں ہے؟ کوئی بتا سکتا ہے، ساری دنیا کو اسلام کی ضرورت ہے، ہمیں دنیا کی ضرورت نہیں۔

حقیقی تبدیلیوں کے سلسلہ میں اگر واقعی ہم سنجیدہ ہیں تو ہمیں بلا تاخیر اصلاح کا آغاز کرنا ہوگا، اسی میں وزراء کی اصلاح بھی شامل ہے، بعض وزراء نمازیں نہیں پڑھتے ہیں، بعض جاہل ہیں، بعض کے ہاتھ کبیرہ گناہوں سے آلودہ ہیں، کچھ وہ بھی ہیں جو پارلیمنٹ میں بد مست ہو کر داخل ہوتے ہیں، بعض ظاہر و باطن میں امریکہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، بعض کو عقائد کا بھی پتہ نہیں کہ دوستی اور دشمنی کی اسلامی بنیادیں کیا ہیں، چنانچہ وزیر خارجہ نے بیان دیا کہ حوثی ہمارے بھائی ہیں اور ان کے ساتھ سمجھوتہ ممکن ہے۔

اسی طرح تمام سفراء اور قونصلیٹ جنرلز کی اصلاح اور ان کو دعوت دین کے کام سے مربوط کرنا ضروری ہے، سفارت خانوں میں صرف ایک مذہبی شعبہ قائم کرنا کافی نہیں، جبکہ دوسرے شعبے سیاسی شعبدہ بازیوں کے تابع ہوں، ایران کے سلسلہ میں بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے، بطور خاص اس لیے کہ وہ پڑوسی ہے جیسا کہ جبیر نے کہا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تشیع اور شرک کو تسلیم کر لیا جائے، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اسرائیل سے دوستی ہو اور ایران کو اپنا واحد دشمن قرار دیا جائے، اگر یہودیوں کے ساتھ صرف خاموشی کا مسئلہ بھی ہوتا تو گوارا تھا لیکن یہاں تو صاف صاف ہم نوائی کا مسئلہ ہے، ایران اسرائیل سے اپنی دشمنی کے اعلان میں سچا ہو یا جھوٹا اس سے بحث نہیں، اگر وہ فلسطینی بھائیوں کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو ہمیں اس کے ساتھ ہونا چاہیے، اگر ایران سچا ہے تو اس کا ساتھ دینا شرعی فریضہ ہے، اور اگر جھوٹا ہے تو کم از کم ہمیں یہودیوں کی دشمنی میں سچا ہونا چاہیے۔

خدانخواستہ اگر ایران کی امریکہ اور اسرائیل سے جنگ چھڑ جائے تو اکثر مسلمان کس کے ساتھ کھڑے ہوں گے؟ اور عوامی مقبولیت کس کی بڑھے گی؟ ایران کی یا سعودی عرب کی؟

اس میں شک نہیں کہ شیعہ دشمنی جگ ظاہر ہے، پھر بھی کیا امریکہ اس سے بڑا دشمن نہیں، امریکہ کی فوج نے اپنے ترجمان جریدہ میں اعتراف کیا ہے کہ وہ سعودی عرب کو تقسیم کرنا چاہتا ہے،

اور اسرائیل کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ جو ہر وقت مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے دینے کے درپئے ہے، روافض اور اہل کتاب میں ایک فرق ہے، جبکہ روافض سخت قسم کی بدعات کے مرتکب ہیں اور اہل کتاب کفر میں سرتاسر ڈوبے ہوئے ہیں، اور وہ یہ کہ روافض کے مظاہر کھردرے ہیں، اور ٹرمپ اور تھن یاہو کا مظہر نرم ولچیلا، یہ ان زہریلے سانپوں سے کم نہیں جو دیکھنے میں خوبصورت ہوں۔

امریکہ اپنی عسکری عداوت اور سعودی عرب کو تقسیم کرنے کی گھناؤنی پالیسی کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کو اپنے نرم ونازک پنجوں سے فتح کر رہا ہے، ہر سڑک پر اس کے بینک، اس کی مصنوعات اور ماکولات ومشروبات کا چلن ہے، اور امریکی پسند وناپسند ہی یہاں کا فیشن اور پہلی پسند بن گیا ہے۔

ہم غیر ضروری ترقیاتی منصوبوں کی باتیں کرتے ہیں، ہمارا دعوی ہے کہ ہم پورے ملک کا نظام الکٹرانک بنادیں گے، اور شاید ایک الکٹرانک حکومت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں، دوسری طرف ہمارے پاس ایسے بھی علاقے ہیں جو زندگی کی بنیادی سہولتوں بجلی اور پانی سے محروم ہیں، بعض علاقوں میں ہسپتال موجود نہیں، کہیں انٹرنٹ اور مواصلات کا نظام ٹھپ ہے، ایسے بھی علاقے سعودی عرب میں ہیں جہاں لوگ گدھوں کی سواری کر کے اپنی قریب ترین ڈسپنسری تک پہونچنے اور فرسٹ ایڈ پانے کے لیے میلوں کا سفر کرتے ہیں، اور کبھی تو ایک حاملہ عورت کی راستہ میں ہی زچگی ہوجاتی ہے، بعض علاقوں میں اب بھی لوگ لکڑی کے پل سے گذرتے ہیں جسے ''الصراط'' کہتے ہیں۔

وہاں اور تہامہ وغیرہ میں سہولیات معدوم ہیں، ساحلی ہموار علاقہ سلسلہ کوہ سروات اور بحر احمر کے درمیان سخت دشواریوں سے دوچار ہے، ان میں بعض خطوں پر ٹرمپ اور اس کی کمپنیوں کا قبضہ ہے، ان علاقوں سے بے توجہی برتنا اور ''شاہراہ فیل'' پر غیر معمولی توجہ دینا کہاں کا انصاف ہے! شاہراہ فیل سے مراد وہ راستہ ہے جدھر سے یمن کے وہ حجاج آتے ہیں جو تہامہ سے مکہ کی جانب بڑھتے ہیں، اس قوم پر تعجب ہے جو پہاڑوں کی تزئین کاری میں مصروف ہے، اور ان افراد سے غافل ہے جو گذرنے کے لیے لکڑی کے کمزور خستہ پل کے علاوہ کوئی راستہ نہیں پاتے، اس المیہ کے باوجود ہم ان سے چاہتے ہیں کہ وہ تصدیق کریں کہ مستقبل تابناک ہے، اور آمدنی کے راستے کھلے ہوئے ہیں، اور تمام تر خدمات الکٹرانک ہونے جارہی ہیں۔

۔اپنی خارجی سیاست میں امارات سے آزاد ہوجائیں، امارات اس سے پہلے سعودی خاندان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اعلان کر چکا ہے، اور یہ دعوی بھی کر چکا ہے کہ سعودی عرب اس کے ایک حصہ پر قابض ہے، جبکہ آپ کی صلاحیتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ ملکوں کے صدور اور وزراء کو جمع کر سکتے ہیں، آپ نے زائد از پچاس ملکوں کے سربراہوں کو ٹرمپ کی ملاقات کے لیے جمع کیا، آپ مسلمانوں کے شیرازہ کو متحد کر سکتے ہیں، امارات کا عرب اتحاد سے ملنا اس کے خاص مقاصد کے لیے ہے، ان میں ایک یمن کو یکا وتنہا کرنا اور دوسرے نام سے امریکہ کے لیے فوجی ٹھکانہ تیار کرنا ہے۔

آپ صراط مستقیم پر قائم رہیں، اور حرمین شریفین کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھیں، شاہراہ ہدایت پر چل کر اور بیت عتیق کی خدمت کر کے مسلمانوں کے دلوں کو جیتنا بھی ضروری ہے، خانہ کعبہ اور مکہ مکرمہ کی خدمت وہ شرف ہے جس میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں، دلوں کو فتح کرنا ذرائع آمدنی کو بڑھانے کے لیے سیاحتی منصوبوں پر اربوں ڈالرز خرچ کرنے سے ہزار درجہ بہتر اور ضروری ہے، بحر احمر کا پروجیکٹ مکمل کرنے سے زیادہ فکر اس کی ہو کہ ہر شہری کو رہنے کے لیے گھر مل جائے، جدہ کے تمام محلوں میں ڈرینج نظام قائم ہو، بحر احمر کو آلودگی سے پاک کیا جائے، ان پروجیکٹس کا رخ مشاعر مقدسہ کی طرف پھیر دیا جائے، رفادہ (غریب حجاج کی ضیافت) اور سقایہ (حجاج کو پانی پلانے کا نظام) قائم ہو۔

حاجیوں کا خون چوسنے کی بجائے مختلف سرکاری محکمہ جات اور اہل خیر حضرات کو حاجیوں کے اکرام اور ان کی رہائش کا انتظام کرنے کا موقع دیا جائے۔

اللہ نے حرم کے شکار کو بدکانے سے منع فرمایا ہے تو ایک مسلمان کو دہشت زدہ کرنا کتنا سنگین گناہ ہوگا، ایک امام کا دہشت کے مارے یہ حال ہوا کہ جب ایک سعودی امام کے غائبانہ میں کسی نے ایک اجنبی کو نماز کے لیے بڑھایا اور اس نے کہا: "الاقامہ" تو یہ بے چارہ ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہوا، کہ کہیں یہ اقامہ تو نہیں مانگ رہا ہے جبکہ اس کا مقصد "اقامة الصلاه" (نماز قائم کرنے) کی درخواست کرنا تھا۔ حرم کے بارے میں کہا گیا کہ جو وہاں داخل ہوا وہ مامون ہے تو پھر کیوں آکر وہاں لوگ تفتیش سے ڈرتے ہیں! زمزم جس مقصد کے لیے پیا جائے اس کا علاج ہے، یہ مشترک طور پر مسلمان استعمال کرتے تھے، کبھی اس گئے گذرے دور کی طرح زمزم کو فروخت نہیں کیا گیا، وہ بھی غنیمت ہے جبکہ جو بیچا جا رہا ہے وہ زمزم ہی ہو حالانکہ اس کی بھی گارنٹی نہیں، اللہ نے مکہ کو صرف سعودی مواطن کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ہدایت کا گھر بنایا ہے، اس میں باہر آنے والوں اور وہاں رہنے والوں میں کوئی فریق نہیں: "سواء العاكف فيه والباد"۔

شیبی خاندان کے علاوہ کسی اور کو خانہ کعبہ کی ''سدانت'' (خدمت) کا موقع دینا امانت میں خیانت ہے، خانہ کعبہ کی کنجی حضور ﷺ نے عثمان بن ابی طلحہ شیبی کو ہی دی تھی، غلاف کعبہ کے لیے مخصوص کارخانہ کی تعمیر کر کے احسان جتانے کے انداز میں بیان دینا درست نہیں، اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنے گھر کی خدمت کا موقع عنایت فرمایا ہے، حرم کے اندر حدود قائم کرنا درست نہیں تو حرم کے حدود میں تلاشی لینا یا اقامہ کی جانچ کرنا بھی جائز نہیں ہوگا، صد عن المسجد الحرام (مسجد حرام سے روکنے) کی دو قسمیں ہیں: باضابطہ حج وعمرہ سے روکنا جس طرح مشرکین روکتے تھے، اور دوسری قسم صد عن المسجد الحرام کی یہ ہے کہ قیمتیں بڑھا کر اور خوف پیدا کر کے اور طرح طرح کے قانون بنا کر لوگوں کو حج سے روکا جائے۔

ہم کبھی امریکہ کے پارٹنر نہیں ہو سکتے، جیسا کہ نتن یاہو اور اس کے وزیر لیبرمان کا ماننا ہے، بلکہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہیں گے، ٹرمپ، اور صہیونیوں کی ناراضگی کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ مسئلہ فلسطین واسرائیل یا یہود وعرب کا نہیں، روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کا مسئلہ ہے۔

علماء کی قدر کریں، یہ نہ ہوں تو حق دنیا سے ناپید ہو جائے، ابن باز اور ابن حمید کا کوئی بدل آج بھی نہیں مل سکتا، اور جو ایسا بننا چاہے اسے قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، دیندار حضرات کی قدر کریں، یہ سگریٹ نہیں پیتے، نشہ آور اشیاء کا استعمال نہیں کرتے، نتیجۃً کینسر اور اس جیسے امراض سے متاثر نہیں ہوتے، صحت کا اہتمام عام ہوتا ہے، علاج کے اخراجات بچتے ہیں، مفکرین اور بلند خیال حکمرانوں کی قدر کریں، افسوس ہے ان کی ناقدری ہو رہی ہے، نجم الدین اربکان، مہاتیر محمد اور رجب طیب اردوغان جیسے لوگ مشکل سے پیدا ہوتے ہیں، اور کیا ناسا کی خلائی ایجنسی میں ڈاکٹر فاروق باز جیسا سائنس داں اور کسی طبی ادارہ میں ڈاکٹر احمد قاضی سے فائق کوئی طبیب ہے؟ سیمسنگ کمپنی نے مصر وشام اور مراقش کے ماہرین کو کوریا میں کام کرنے کے لیے کیوں چنا ہے؟ ان کی قابلیت کی وجہ سے، اور کوئی وجہ نہیں۔

اور کیا مفکرین میں آپ کو عباس محمود العقاد، جعفر شیخ ادریس، مودودی اور مسیری کا ہم پلہ کوئی نظر آتا ہے، اور اگر ان میں سے کوئی یورپ میں ہوتا تو آج اہل مغرب ان کے لیے کیا کیا کرتے؟ اور آپ ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں!

یقین کیجئے! آج بھی لوگ سعودی عرب اور وہاں کے لوگوں کی قدر کرتے ہیں، ان کے یہاں کوئی ظہران سے بھی آجائے تو اسے مکہ کا سمجھتے ہیں، مجھے ایک شخص نے کہا: آپ مکہ کے نہیں لیکن مکہ جب چاہیں جا تو سکتے ہیں، یہ کیا کم ہے، اور یہ عزت صرف حقیقی

اسلام کی بدولت ہے، اس امریکی اسلام کی بدولت نہیں جسے معتدل اسلام کا نام دیا جارہا ہے، اس لیے یہاں ہر شعبہ میں اسلامی احکام کا نفاذ ضروری ہے۔

مغربی طاقتیں بلاد حرمین کو اہل کتاب کے تابع بنا دینا چاہتی ہیں، لیکن اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، اور ان لوگوں کی نصرت فرمائے گا جو معاشرہ کی کشتی میں شگاف ڈالنے والوں کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج سعودی عرب حق کے لیے سینہ سپر ہو جانے والی جماعتوں کو دہشت گرد کہہ رہا ہے جبکہ اسے خود بڑھ کر یہودیوں کے ساتھ سب سے پہلے برسر پیکار ہونا چاہیے۔

تضادات سے بچو، یہ عجیب تضاد ہے کہ وزراء میں صالحین بھی ہیں اور فاسق وفاجر بھی، اور یہ بھی فساد کا مفہوم شرعی دار القضاء میں کچھ اور ہے اور اینٹی کرپشن اسکواڈ کے نزدیک کچھ اور، اور اس سے بڑھ کر دوغلا پن کیا ہوگا کہ قرآن وسنت کا الگ چینل ہے اور ساتھ ہی لہو ولعب کے چینل کی بھی اجازت ہے، ہم کہاں کے اہل توحید باقی رہے!!

ایک مسئلہ نام کا بھی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک قبیلہ کا نام اس کے کسی جد امجد کے نام پر رکھ دیا جائے، جیسے بنی ہلال، بنی خالد وغیرہ، سعودی عرب کا موجودہ نام فؤاد حمزہ نے رکھا جو دروزی تھا، پھر موت کے وقت گواہی دی کہ میں اہل سنت والجماعت کے عقیدہ پر ہوں جیسا کہ ان کے دوست خیر الدین زرکلی نے ''الاعلام'' میں ذکر کیا ہے، مسلمانوں نے اپنا نام ''محمدین'' یا ''محمڈن'' نہیں رکھا جیسا کہ عیسائیوں نے اپنی نسبت حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف کرتے ہوئے ''مسیحی'' یا ''عیسائی'' رکھی ہے، مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے بسائے ہوئے شہروں کو ''عمریہ'' نہیں کہا، جیسا کہ سابق میں لوگوں نے ''شہر صدام'' اور اب ''شہر صدر'' بغداد کے قریب ایک علاقہ کا نام رکھ لیا، ایسے ہی عزیزیہ، فیصلیہ، ناصریہ، مشعلیہ وغیرہ نام رکھے گئے ہیں، ناموں کا بدلنا دنیا میں عام بات ہے، ایتھوپیا کو پہلے حبشہ کہتے تھے، موریتانیہ کو شنقیط، مصر کو جمہوریۃ عربیہ متحدہ کہتے تھے، اب اس کا نام ''جمہوریۃ مصر عربیہ''، تھائی لینڈ کا نام سیام تھا، سری لنکا کا نام سیلان تھا، تنجنیقا کا نام تنزانیہ ہو گیا، اس کی بے شمار مثالیں ہیں، یہاں بھی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، اس کے بعض ارکان اب بھی زندہ ہیں، اس کمیٹی نے سعودی عرب کا نام ''المملكة الاسلامية المتحدة'' تجویز کیا گیا تھا، لیکن وہ تجویز ماضی کے دھندلکوں میں چھپ گئی، یہ لفظ سعودیہ کی توہین نہیں لیکن شیخ ابن باز، شیخ ابن عثیمین اور شیخ فوزان بلکہ اللجنة الدائمة للافتاء نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ ملک کا نام ''المملكة العربية السعودية'' رکھنا غیر اسلامی عمل تھا۔

اللجنة الدائمة للافتاء کے فتاوی پر اب خال خال عمل ہو رہا ہے، اس کے متعدد فتووں پر عمل ندارد ہے، ان میں ایک فتوی اہل کفر کے جزیرۃ العرب میں داخلہ کے ممنوع ہونے کا بھی ہے، اب کہاں اس پر عمل ہے۔

اے آل سعود! اگر تم جلد از جلد توبہ نہیں کرتے تو تمہارے ساتھ بھی وہی ہونے والا ہے جو تم جیسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی طرف سے ہوتا رہا ہے، اور اس کا ایک انجام حکومت پر بوڑھاپے کا طاری ہونا ہے، جس کے بارے میں ابن خلدون نے لکھا ہے کہ جب حکومت پر بوڑھاپا طاری ہوتا ہے تو وہ زیادہ دن نہیں چلتی، شاہی خانوادہ میں نزاع باہمی اس کا ایک مظہر ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا حق ہے کہ جس چیز کو بھی اونچا اٹھاتا ہے اسے نیچے بھی گراتا ہے''۔

ملے عروج تو مغرور مت کبھی ہونا
بلندیوں کے سبھی راستے ڈھلان سے ہیں

☆☆☆

□پیامِ سیرت

دیکھ زمانے کے رنگ ہیں ہزار!

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''ایک دن آئے گا، تو دیکھے گا کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا، دوں گا''۔

آج جب اسے بلاکر چابی اس کے حوالے کی گئی تو اس کا ذہن ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

یہ جملہ جو اس سے دس بارہ سال پہلے کسی نے کہا تھا......آج حرف بحرف سچ ثابت ہوا تھا۔

رہ رہ کے اسے سالوں پرانا وہ واقعہ یاد آرہا تھا۔

ایک بار پھر اسے اپنی اُس غلطی پر افسوس ہو رہا تھا۔

''کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا''۔ اس نے دل میں سوچا۔

ایک طویل عرصہ بیت گیا تھا......مگر اسے وہ دن آج بھی ایسے یاد تھا جیسے کل کی بات ہو۔

دس بارہ سال کا دور ہی کیا ہوتا ہے!......پلک جھپکتے گذر جاتا ہے۔

مگر اسی مختصر سے عرصے میں یہاں تو کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔

ایک عجیب انقلاب!......ایک عظیم تبدیلی!......جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔

جو بے بس تھے......وہ سب سے بڑی طاقت بن گئے تھے۔

جو خود کو تخت وتاج کا مالک سمجھتے تھے......ان کا سارا کروفر رفو چکر ہو چکا تھا۔

خود اُس کے لیے بھی یہ لمحہ کتنا اتار چڑھاؤ لیے ہوئے تھا۔

ایک وقت تھا کہ اُس نے کسی کو چابی دینے سے انکار کر دیا تھا......مگر آج......وہی عظیم انسان وہی چابی اس کے حوالے کر رہا تھا۔

جسے اس نے سخت سست اور برا بھلا کہا تھا......وہی عظیم شخص آج اسے اعزاز دے رہا تھا۔

شہر بھی وہی شہر تھا......زمین بھی وہی زمین تھی......مگر......پھر بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔

چہرے وہی تھے......بس رنگ بدلے ہوئے تھے۔

آنکھیں وہی تھیں......بس ان کی پتلیوں پر خاکے دوسرے تھے۔

آج سے ٹھیک آٹھ سال پہلے ایک شخص کو اس کے ساتھیوں سمیت اِسی شہر سے نکالا گیا تھا۔

اُس وقت بظاہر وہ کتنا لاچار اور بے بس تھا۔

مگر آج......آج......اس کے ساتھ دس ہزار کا لاؤ لشکر تھا۔

آج وہ فاتح کی حیثیت سے اُسی شہر میں داخل ہو رہا تھا۔

آج اس کے ساتھ جاں نثاروں کی ایک فوج تھی۔

آج اس کے ساتھ اس کے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ تھی......جو اس کے اشارۂ ابرو اور جنبشِ لب پر دنیا زیروزبر کر سکتی تھی۔

آج وہ سیاہ وسفید کا مالک تھا۔

اس کے سامنے وہ لوگ لاچار و مجبور کھڑے تھے.....جنھوں نے کل اس پر پتھر برسائے تھے۔

اس کے وہ دشمن آنکھیں جھکائے کھڑے تھے.....جنھوں کل اسے زخم پر زخم دیے تھے۔

وہ بھی تھے.....جنھوں نے درد ہائے دل سے اسے نوازا تھا۔

وہ بھی تھے .....جنھوں نے گالیاں دی تھیں.....طعنے دیے تھے.....زبانی حملے کیے تھے۔

وہ سب تھے.....جو رستے میں اس کا مذاق اڑاتے تھے.....چلتے پھرتے اس سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

وہ ظالم بھی تھے .....جنھوں نے اس کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔

وہ اوباش بھی تھے.....جنھوں نے نہ جانے کتنی بار اس کے دل میں چرکے لگائے تھے۔

آج سب اس کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے.....اور وہ سیاہ وسفید کا مالک تھا۔

کل جس کا کوئی وزن نہ تھا.....آج .....اس کی ہیبت سے دشمنوں کے دل دہل رہے تھے۔

''عباس!.....تیرے بھتیجے نے تو بڑی عظیم سلطنت حاصل کر لی ہے!!''۔اس کا سب سے سخت حریف ابوسفیان کہہ رہا تھا۔

''ابن حرب!.....یہ سلطنت نہیں.....یہ نبوت ہے''۔اس کے چچا نے جواب دیا۔

کل یہی گلیاں تھیں اور وہ سب کی گالیوں کا نشانہ.....اور آج اِنھی گلیوں میں وہ سب پر غالب وحاکم۔

کل یہی رستے تھے اور وہ سب کا تختۂ مشق وستم.....اور آج اِنھی رستوں میں اس کے جلو میں دس ہزار کا لشکر جرار۔

دنیا نے کتنے رنگ بدل لیے تھے ان آٹھ سالوں میں!

کل وہ دشمن کے خوف سے جس شہر کے رستوں پر پاؤں بھی آہستہ رکھتا تھا.....آج جب وہ مرالظہران سے شہر مکہ کی طرف بڑھا .....تو قدموں کے شور سے زمین کا سینہ بھی کانپ اٹھا۔

آج اس کے پاس قوت وشوکت تھی.....اقتدار وسلطنت تھی.....حکومت وسیادت تھی۔

آج وہ فاتحانہ غرور دکھلا سکتا تھا۔

آج وہ شاہانہ طمطراق سے دوسروں کے دل دہلا سکتا تھا۔

آج وہ حاکمانہ گرج سے دشمنوں کے کان پھاڑ سکتا تھا۔

اس کے سارے دشمن.....بے بسی کی حالت میں اس کے فیصلے کے منتظر تھے۔

وہ اگر چاہتا تو سب کے سر تن سے جدا کر دیتا۔

وہ اگر چاہتا تو کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔

''آج انتقام کا دن ہے.....آج قریش کی ذلت کا دن ہے''۔

اس کے ایک سپاہی نے نعرہ لگا دیا۔

''نہیں.....نہیں.....آج معافی کا دن ہے.....آج قریش کی عزت وسرخروئی کا دن ہے''۔اس نے جھٹ سے اس کی کاٹ کی .....اور اس کے ہاتھ سے جھنڈا لے لیا۔

اسے فاتحانہ نعرے بھی پسند نہ تھے۔

وہ جب دروازے سے داخل ہوا تو..... سر جھکا ہوا تھا.....اور.....چہرے پر شکر خداوندی کے جذبات تھے۔

نہ کوئی فاتحانہ انداز.....نہ شاہانہ طمطراق.....نہ حاکمانہ گرج.....اور.....نہ شہنشاہانہ انداز۔

''تم جا سکتے ہو.....تم سب آزاد ہو.....آج تم پر کوئی ملامت نہیں''۔اس نے انتقام لینے کی بجائے سب کو معاف کر دیا۔

اس کا یہ انداز سب کو رُلا گیا۔

ظالم دشمنوں کو بھی کوئی ایسے معاف کرتا ہے بھلا!!

ہر درد والم سے گذارنے والے ستم گروں کو بھی یوں چھوڑا جاتا ہے کہیں!!

مگر وہ سب سے نرالا تھا.....سب سے منفرد.....اور.....سب سے عظیم۔

جب وہ بیت اللہ میں داخل ہوا تو اسے بھی دس بارہ سال پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا۔

ایک دن اس نے کلید بردارِ کعبہ سے کعبے کی چابی مانگی تھی.....مگر اسے ٹکا سا جواب ملا تھا۔

اور آج وہی چابی اس کے ہاتھ میں تھی.....اسے اختیار تھا جسے چاہے دے۔

''اے رسول پاک!.....یہ چابی مجھے دے دیجیے.....میرے خاندان میں چاہ زمزم کی دیکھ بھال اور کلید برداری.....دونوں ذمہ داریاں اکٹھی ہو جائیں گی''۔ اس کے چچا عباس نے درخواست کی۔

''مجھے عنایت کر دیجیے یہ چابی.....''۔ اس کے چچازاد بھائی علی نے فرمائش کر دی۔

مگر آج کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

''عثمان بن طلحہ!.....لو یہ چابی تمھارے حوالے.....آج کے بعد جو کوئی بھی تم سے چھینے گا.....وہ ظالم ہوگا''۔

یہ کہہ کر اس نے چابی اُسی کو دے دی.....جس نے سالوں قبل چابی مانگنے پر اسے دھتکار دیا تھا۔

اور جب چابی عثمان کے ہاتھوں میں پہنچی تو اس کی آواز نے اس کے ذہن کو دس بارہ سال پہلے کے اُس واقعے کی طرف منتقل کر دیا۔

اب اس کے ہاتھ میں چابی تھی.....اور.....آنکھوں میں ماضی کی وہ تصویر۔

اسے رہ رہ کے اپنی وہ سابقہ حرکت یاد آ رہی تھی۔

کبھی وہ خود کو دیکھتا.....کبھی اُس چابی کو.....اور کبھی اپنے اِس عظیم محسن کو۔

''میں نے تم سے اس دن کہا نہ تھا کہ.....ایک دن آئے گا جب یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا، دوں گا''۔

جب وہ جانے لگا تو اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا.....اور اس کا سر جذبۂ احسان مندی سے خم ہو گیا۔

وہ وہاں سے چلا تو گیا.....مگر.....اس کے پردۂ ذہن سے ماضی کی وہ تصویر غائب نہ ہوئی۔

یہ ذکر ہے صحابی رسول حضرت عثمان بن طلحہ کا.....جن کا خاندان خانۂ کعبہ کا کلید بردار تھا.....انھوں نے ہجرت سے قبل حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن عاص کے ساتھ اسلام قبول کیا.....حضرت معاویہؓ کے دور حکومت میں وفات پائی۔

ہجرت سے پہلے ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ان سے کعبے کی چابی مانگی.....انھوں نے دینے سے انکار کر دیا اور آپ ﷺ کو سخت الفاظ کہے.....اس وقت آپ ﷺ نے ان سے اور تو کچھ نہ کہا.....بس اتنا کہا کہ ایک دن آئے گا جب یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا، اسے دوں گا.....اور اب جب مکہ فتح ہوا.....آپ ﷺ مکے کے حاکم ہوئے تو آپ ﷺ نے وہ چابی منگوائی.....کئی لوگوں نے آپ سے فرمائش کی.....مگر.....آپ نے وہ اِنھی عثمان کے حوالے کی۔

یہ آپ ﷺ کے کرم کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

اس واقعے میں ہمارے لیے دو سبق ہیں:

ایک یہ کہ جب ہم صاحبِ قوت ہوں تو اس کا غلط استعمال نہ کریں.....کسی کی مجبوری اور بے بسی کا مذاق نہ اڑائیں.....اپنے اقتدار و اختیار سے دوسروں کی خوشی کا سامان کریں، نہ کہ انھیں غلط ٹارچر کریں۔

دوسرے یہ کہ ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ برابری کا سلوک نہ کریں.....جس نے ہمارے ساتھ برا بھی کیا ہو.....ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے ساتھ اچھا ہی کریں.....عثمان بن طلحہ نے آپ کے ساتھ بدترین رویہ اپنایا تھا.....مگر.....آپ نے ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا.....یہ ہمارے لئے اسوۂ رسول ہے.....اسے ہمیشہ ہم اپنا نصب العین بنائے رکھیں.....اسی میں کامیابی ہے۔

☆☆☆

❑ نقد ونظر

تعمیری تنقید!

امت میں تنقیدی شعور بھی ہونا چاہیے، اور تنقید کی جرأت بھی، خواہ کتنی ہی مشکل صورت حال ہو

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(سکریٹری وترجمان آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت دی ہے، اس لحاظ سے اسے ایک بااختیار مخلوق بنایا گیا ہے، اور اسی وجہ سے اس کے عمل سے دنیا وآخرت میں جزاء وسزا کا حکم متعلق ہے، اسی قوت وصلاحیت کی بناء پر وہ دانستہ بھی غلطی کرتا ہے اور نادانستہ بھی، کبھی جان بوجھ کر غلطی کا مرتکب ہوتا ہے، اور کبھی انجانے میں، انسان کی اس فطری کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر انسان کہیں نہ کہیں خطاء کا مرتکب ہوتا ہے، کل بنی آدم خطاّء (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۲۵۱)؛ اس لئے یہ حقیقت ہے کہ سوائے انبیاء کرام کے بڑے سے بڑا آدمی بھی معصوم نہیں، انبیاء چوں کہ انسان کے لئے نمونہ اور آئیڈیل ہوتے ہیں، اور ان کی زندگی اسوہ ہوتی ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی حیات طیبہ فکر وعمل کی کوتاہیوں سے پاک ہو، انبیاء کے علاوہ کسی شخص کے بارے میں گناہوں سے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی اس فطری کمزوری کا حل بھی بتایا کہ انسان کو چاہئے کہ جوں ہی اس کو اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے، خواہ خود غور وفکر کے نتیجہ میں یا لوگوں کے توجہ دلانے پر، تو وہ اپنی غلطی پر اصرار نہ کرے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی غلطی سے رجوع کرلے، اور تائب ہوجائے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین خطاء کار وہ ہے جو توبہ کرلے: وخیر الخطائین التوابون (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۲۵۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی غلطی پر متنبہ کیا جائے اور درست تنقید کی جائے تو اسے برا نہیں ماننا چاہئے؛ بلکہ اسے قبول کرنا اور اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا چاہئے؛ اسی لئے شریعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی: نیکی کی دعوت اور برائی سے روکنے کے عمل کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، مُنکَر سے مراد ہر ایسی چیز ہے جو روکے جانے کے لائق ہو، جس پر نکیر کرنے کا حکم ہو اور جو کسی بھی درجہ میں ناپسندیدہ ہو؛ البتہ جو عمل جس درجہ ناپسندیدہ ہوگا، اس سے منع کرنے کا اسلوب بھی اسی درجہ کا ہوگا، اسی طرح جس کو منع کیا جارہا ہو، اس کے مقام ومرتبہ کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے، جیسے اولاد کو روکنے کا انداز الگ ہوگا اور والدین کو منع کرنے کا انداز الگ، حکام اور سربراہ کو متنبہ کرنے کا الگ طریقہ ہوگا اور عوام کو متنبہ کرنے کے الفاظ الگ ہوں گے؛ لیکن بہرحال نہی عن المنکر کی اجازت؛ بلکہ اس کا حکم اس بات کو واضح کرتا ہے کہ امت میں تنقیدی شعور بھی ہونا چاہئے اور تنقید کی جراءت بھی، خواہ کتنی ہی مشکل صورت حال ہو، ضروری ہے کہ تنقید کا حوصلہ برقرار رکھا جائے، خوف اور خطرات اس کی زبان کو گنگ نہ کردیں؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہے: افضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جائر (شعب الایمان، حدیث نمبر: ۷۹۳۶) دوسری طرف یہ فرما کر کہ ہر آدمی سے خطا ہوسکتی ہے، آپ نے امت کے تمام طبقات کو تعلیم دی کہ

اس کے اندر تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے، اسے یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ مجھ سے غلطی ہوسکتی ہے، یہ غلطی ناواقفیت کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے اور جانتے بوجھتے نفس اور شیطان کے اکسانے پر بھی ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کا ایسا مزاج بنایا کہ اگر کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات خلاف معمول معلوم ہوتی تو کمال ادب کے ساتھ اس پر ٹوکتے، ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، یہ بات بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کے خلاف تھی کہ ظالم کے خلاف مزاحمت کی جائے اور مظلوم کی مدد کی جائے؛ چنانچہ صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں خاموشی اختیار نہیں کی؛ بلکہ عرض کیا: کہ مظلوم کی مدد کرنا تو ٹھیک ہے؛ لیکن ہم ظالم کی مدد کیسے کریں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ تم اس کا ہاتھ تھام لو اور ظلم نہ کرنے دو: تأخذ فوق يديه (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۴)

بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے الگ تھی، صحابہؓ نے اس سے مختلف مشورہ دیا؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ برا نہیں مانا؛ بلکہ اپنے رفقاء کی رائے کو ترجیح دی؛ حالاں کہ بعد کے حالات سے واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی درست رائے تھی، جیسا کہ غزوہ احد میں آپ چاہتے تھے کہ شہر میں رہ کر مقابلہ کریں؛ لیکن بعض پرجوش نوجوان صحابہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو ترجیح دی (البدایہ والنہایہ: ۴۱۱)۔

غزوۂ خندق کے موقع سے صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آپ کی رائے تھی کہ دشمنوں سے اس بات پر صلح کرلی جائے کہ مدینہ کی پیداوار کا کچھ حصہ انہیں سالانہ ادا کیا جائے گا؛ لیکن رؤسائے انصار حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہؓ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہم نے تو زمانۂ جاہلیت میں بھی ایسا حقارت آمیز معاہدہ نہیں کیا اور اب تو ہم مسلمان ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کے مشورہ کو قبول فرمالیا۔ (سیرۃ ابن ہشام: ۲۲۳) ایک دفعہ نماز پڑھاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعت والی نماز میں تیسری ہی رکعت پر سلام پھیر دیا، بیشتر صحابہ خاموش رہے؛ لیکن ذوالیدین نامی ایک صحابی نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز کی رکعات میں کمی کردی گئی ہے یا آپ سے بھول ہوئی ہے؟ أ نقصت الصلاة أم نسيت يا رسول الله (نسائی، حدیث نمبر: ۱۲۲۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر حاضرین سے دریافت کیا اور جب تصدیق ہو گئی کہ آپ نے تین ہی رکعت پر سلام پھیر دیا ہے تو نماز پوری فرمائی (حوالہ سابق)

یہ واقعات اس مزاج کو ظاہر کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لئے چاہتے تھے، اس کی سب سے اہم مثال وہ ہے جب غزوۂ حنین کے موقع سے ڈھیر سارا مال حاصل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا مال اسلام سے مانوس کرنے کے لئے فتح مکہ کے موقع سے اسلام قبول کرنے والے نومسلموں اور بعض دیگر حضرات کو عنایت فرمایا اور انصار کو اس میں سے کچھ بھی نہیں دیا، اس بات نے نہ صرف مدینہ کے نوجوانوں؛ بلکہ عمر رسیدہ انصار کو بھی متاثر کیا اور ان کو آپ کا یہ فیصلہ ناگوار گزرا؛ لیکن ان کو اس میں کوئی تامل نہیں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب واحترام کی پوری رعایت کرتے ہوئے اپنا شکوہ پیش کریں؛ چنانچہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے انصار کی ترجمانی کی، اور اس عمل کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ شکایت انصار کے دوسروں لوگوں کو ہے یا تم کو بھی ہے؟ تو انہوں نے بلا تامل اور برملا عرض کیا کہ میں بھی اپنی قوم کے ان جذبات میں شریک ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو ایک جگہ جمع کرایا اور نہایت اثر انگیز خطبہ کے ذریعہ اپنے اس فیصلہ کی وضاحت کی، اور انصار اس سے مطمئن ہوئے (مسند احمد ابن حنبل، حدیث نمبر: ۱۱۷۸۴) غور فرمائیے کہ نہ صحابہ کو اپنی شکایت پیش کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ سے

متعلق اپنے تحفظات پیش کرنے میں تامل ہوا، اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شکایت کا برا مانا۔

مگر افسوس کہ اب مسلمانوں میں نہ تعمیری تنقید کا حوصلہ رہا، نہ تنقید کرنے کا سلیقہ، اور نہ تنقید کو برداشت کرنے کا مزاج، قریب قریب پورے عالم اسلام کی یہی صورت حال ہے، اگر فوج حکومت پر مسلط ہوگئی تب تو انسان کو شاید اتنے حقوق بھی نہیں دئے جاتے جو جانوروں کو حاصل ہیں، عراق، شام، یمن، تیونس اور کچھ خطوں کو چھوڑ کر پاکستان وغیرہ کی یہی صورت حال ہے، اور عالم عرب کی صورت حال تو بدتر؛ بلکہ بدترین ہے، جہاں مکمل زبان بندی نافذ ہے، اور حکومت کے موقف کے خلاف ایک حرف لکھنے کی اجازت نہیں، تجسس کا ایسا نظام ہے کہ عوام اپنی خلوتوں میں بھی کچھ کہنے سے گھبراتے ہیں، اگر فکر وخیال کو قید کرنے اور اس پر پہرہ بٹھانے کی گنجائش ہوتی تو شاید حکمراں یہ بھی کر گزرتے، حد یہ ہے کہ جو حکمراں درست یا نادرست طریقہ پر الیکشن لڑ کر آتے ہیں، ان کا حال بھی مختلف نہیں ہے، ہندوستان کے مشرقی پڑوسی بنگلہ دیش میں آئے دن حزب مخالف کے لیڈروں کو پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے یا عمر قید کی سزائیں دی جاتی ہیں، کاش! یہ ممالک امریکہ یورپ اور ہندوستان جیسے ملکوں سے سبق لیتے کہ وہاں پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر، نیز اخبارات، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا میں کس قدر حکومت کی کارکردگی کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اسی تنقید کا نتیجہ ہے کہ حکومت کے اندر عوام کے سامنے جوابدہی کا خوف ہوتا ہے، سیاسی استحکام قائم رہتا ہے، حکومتیں بدلتی رہتی ہیں؛ لیکن نظام میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، ملک کی ترقی جاری رہتی ہے، اور بیرونی سرمایہ کاروں کا اعتماد قائم رہتا ہے۔

تنقید کے برداشت نہ کرنے کی ایک بدترین مثال ابھی سامنے آئی ہے، جب ترکی میں موجود سعودی سفارت خانہ کے اندر سعودی جرنلسٹ جمال خاشقجی کے انسانیت سوز قتل کا واقعہ پیش آیا، جانور بھی اتنی بے رحمی سے ذبح نہیں کئے جاتے، جتنی بے رحمی سے ایک معزز صحافی کو قتل کیا گیا، صورت حال یہ ہے کہ قانون کی حدوں کو پار کر کے حکومت کے ذمہ دار افراد نے اپنے پرداختہ اور تربیت یافتہ غنڈوں کو بھیج کر یہ قتل کرایا، اور باوجودیکہ سعودی حکومت نے اس واقعہ کے چھپانے کی تدبیر میں کوئی کسر نہیں رکھی اور ابتداء دروغ گوئی سے بھی کام لیا؛ لیکن ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین (آل عمران:۵۴) کے مصداق یہ ساری تدبیریں ناکام ہوکر رہ گئیں اور جرم کا اعتراف کرنے کے سوا چارہ نہیں رہا؛ البتہ میڈیا کے بیان کے مطابق اب کوشش کی جارہی ہے کہ حقیقی مجرم کو بچانے کے لئے کچھ لوگوں کو قربانی کا بکرا بنادیا جائے اور واقعہ کی آزادانہ تحقیق روک دی جائے۔

خیر، یہ جو کچھ ہوا، اور جن لوگوں نے کیا، وہ تو آخرت میں اپنے عمل کے جوابدہ ہوں گے اور دنیا میں بھی ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنے آخری انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؛ لیکن قابل غور پہلو امت کا یہ بگڑتا ہوا مزاج ہے کہ ایک تو برائیوں کو روکنا جن لوگوں کی ذمہ داری ہے، وہ بدترین قسم کے نفاق اور چاپلوسی میں مبتلا ہیں، اور اسلام دشمن حکمراں کو محدّث اور مُلہَم جیسے القاب سے نواز رہے ہیں، جن کا استعمال رسول حق ترجمان نے سیدنا حضرت عمر فاروق کے بارے میں فرمایا تھا، یہ کیسی جسارت، بے شرمی اور چاپلوسی ہے، یہ تو مسلمان حکمرانوں کا حال ہے؛ لیکن افسوس کہ عمومی طور پر مسلمانوں میں تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت ختم ہوتی جارہی ہے، اور مسلمانوں کے تمام طبقات اس مرض کا شکار ہیں، حلقہ تصوف میں تو پتہ نہیں کہاں سے یہ بات زبان زد عام وخاص ہوگئی کہ پیر مغاں جو بھی کہہ دے مرید کو قبول کر لینا چاہئے:

بہ مئے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

حالاں کہ علماء حقانی اور مشائخ ربانی اپنے مقتدیٰ سے بھی اختلاف کرتے رہے ہیں، سرخیل صوفیاء شیخ اکبر امین عربی پر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے جو تنقیدیں کی ہیں اور ''فصوص الحکم'' کے مضامین پر نقد کیا ہے، وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

نیز صحابہ سے بڑھ کر راہ سلوک کا رہبر کون ہوسکتا ہے، اور فقہاء مجتہدین سے بڑھ کر دین وشریعت کا رمز شناس کیا کوئی اور ہوسکتا

ہے؟؛ لیکن انہوں نے کبھی اپنے متبعین سے ایسی بے چون و چرا پیروی کا مطالبہ نہیں کیا؛ مگر اب ملت کے ہر شعبہ میں یہی مزاج در آیا ہے، چاہے مذہبی وملی تنظیمیں ہوں، مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں ہوں، تعلیمی وتربیتی ادارے ہوں، یہاں تک کہ مساجد کے نظم ونسق کے ذمہ دار ہوں، ہر جگہ یہی صورت حال ہے کہ ذمہ داروں کے اندر معمولی تنقید سننے کا بھی حوصلہ نہیں ہے، حد یہ ہے کہ اب یہ مزاج ہماری دینی درسگاہوں میں بھی پہنچ گیا ہے کہ بہت سے اساتذہ کو اپنے طلبہ کا سوال کرنا برداشت نہیں ہوتا، یہ کسی بھی قوم کے لئے بہت ہی بدبختانہ بات ہے، اور اس کے علمی وفکری زوال کا پیش خیمہ ہے کہ لوگوں میں برائی کو برائی کہنے کا حوصلہ باقی نہ رہے، وہ اہل اختیار کی خوشامد اور چاپلوسی کے عادی ہو جائیں، نہ صرف یہ کہ غلطی پر خاموش رہیں؛ بلکہ ارباب اختیار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے رات کو دن اور دن کو رات کہنے کو بھی تیار ہو جائیں، اور دوسری طرف ارباب اختیار اپنے آپ کو تنقید سے بالا تر سمجھنے لگیں، اور مشورہ لینا اور مشورہ سننا ان کو بارِ خاطر ہو۔

یقیناً سربراہ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ لیکن اس کی بھی حدود ہیں، سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ کے دن منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: میری بات سنو! اللہ تم پر رحم فرمائے، مجمع میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے، کہنے لگے: خدا کی قسم! نہ ہم آپ کی بات سنیں گے اور نہ مانیں گے، یہ کوئی اور صحابی نہیں تھے؛ بلکہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی تھے، حضرت عمرؓ کو ان جیسے صحابی کے احتجاج پر حیرت ہوئی اور انہوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے اس کا سبب دریافت فرمایا، حضرت سلمان نے کہا: اس لئے کہ آپ نے امتیاز سے کام لیا ہے، آپ نے ہم لوگوں کو ایک ایک چادر دی ہے اور خود دو چادریں اوڑھ رکھی ہیں، یہ چادریں بیت المال کی جانب سے تقسیم کی گئی تھیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: کہاں ہیں عبداللہ بن عمرؓ؟ حضرت عبداللہ اُٹھے، آپ نے ان سے دریافت کیا: یہ دوسری چادر کس کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: میری، پھر آپ نے مجمع کے سامنے وضاحت فرمائی کہ جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں، میں دراز قامت آدمی ہوں، میرے حصہ میں جو چادر پڑی تھی، وہ چھوٹی پڑ گئی، میرے بیٹے عبداللہ نے اپنے حصہ کی چادر بھی مجھے دے دی، میں نے ان دونوں چادروں کو ملا لیا ہے، حضرت سلمان فارسیؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے: اللہ کا شکر ہے امیر المؤمنین! اب ہم آپ کی بات سنیں گے بھی اور اس پر عمل بھی کریں گے: فقل، الان نسمع (اعلام الموقعین: ۱۱۲۸) یہ ایک بہترین مثال ہے اس مزاج کی، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تربیت فرمائی تھی، ایسا نہیں تھا کہ قوم کا سربراہ یہ سمجھتا کہ میں جو کچھ کہوں، قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے بے چون و چرا تسلیم کر لے اور اس کو حق نہیں ہے کہ مجھ سے حساب لے، نہ لوگوں کو اپنے سربراہ کو ٹوکنے اور روکنے میں تامل ہوتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی مقدس ہو، یہی مزاج فقہاء تک پہنچا، جو نہایت فراخدلی کے ساتھ اور کسی ناگواری کے بغیر اختلاف رائے کو سنتے تھے، اس پر غور کرتے تھے، اس کو اہمیت دیتے تھے، اور اگر ان کی بات معقول محسوس ہوتی تو بے تکلف اسے قبول کرتے تھے، اور جس نے غلطی کی نشاندہی کی ہو، اسے اپنا محسن سمجھتے تھے۔

جہاں تعمیری تنقید کی جاتی ہو اور اسے قبول کیا جاتا ہو، وہاں انسان کے اندر خود احتسابی پیدا ہوتی ہے، اپنی غلطیوں کو درست کرنے کا موقع ملتا ہے، اگر اس نے کوئی قدم غلط اٹھالیا ہو تو وہ دبے پاؤں اس سے واپس ہو سکتا ہے، محرومِ منزل ہونے سے خود کو بچا سکتا ہے، رفقاء کے درمیان باہمی اعتماد قائم رہتا ہے، دیرپا اتحاد پیدا ہوتا ہے، اور اگر افراد بدل بھی جائیں تو ادارے اور جمعیتیں باقی رہتی ہیں؛ اس لئے ایسے واقعات سے سبق لینے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے اپنے دائرہ میں شفافیت اور کھلے پن کا ماحول پیدا کریں، جبر وظلم کے ذریعہ نہیں؛ بلکہ محبت اور پاکیزگی کردار کے ذریعہ اپنے ماتحتوں کا دل جیتیں اور اپنے مقصد کو اپنی شخصیت سے زیادہ عزیز رکھیں۔ (بشکریہ روزنامہ انقلاب ۲ نومبر ۲۰۱۸ء)

☆☆☆

❑ احتساب

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستین کا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

شہزادہ گلفام محمد بن سلمان خوش قسمت ہیں کہ انہیں نقصان مایہ کچھ نہیں ہوا، بدقسمت ہیں کہ شماتت ہمسایہ ان کو بہت ملی، دنیا ان کی مذمت میں ''رطب اللسان'' ہے۔ ہر روز جب صبح ہوتی ہے اور ہر شام جب شامِ غریباں اپنی زلفیں لہراتی ہے، ساری دنیا کے اہل قلم اور اہل نظر عوام اور خواص جمال خاشقجی کی موت کا اور شہزادۂ گلفام کی عقل کا ماتم کرتے ہیں۔ کیا عرب اور کیا عجم، کیا امریکہ اور کیا یورپ، کیا ترکی اور کیا مجلس امم، سب انسانی حقوق کی پامالی اور جمال خاشقجی کے خون ناحق کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے ہیں، ہر روز و ہر جگہ یہی تذکرہ ہے۔ اخبارات کے کالم اس ذکر سے لبریز ہیں۔

جمال خاشقجی بہت بڑا صحافی تھا، سعودی تھا، لیکن سعودی شہزادہ کی پالیسی کا ناقد تھا، اس نے خود سے جلاوطنی اختیار کرلی تھی، اور واشنگٹن پوسٹ کا کالم نگار تھا، وہ ۱۹۵۹ء میں مدینہ منورہ کی سرزمین میں پیدا ہوا، اس کے آبا واجداد ترکی کے رہنے والے تھے، اور ۵۰۰ سال قبل انہوں نے حرمین شریفین کو اپنا وطن بنایا تھا، اس کے خاندان کے لوگ سعودی عرب میں وزیر بھی رہے، اور مسجد نبوی کے مؤذن بھی رہے، اسلحہ کے مشہور تاجر عدنان خاشقجی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ جمال خاشقجی نے شادی کی تھی، اور صاحب اولاد تھا، بڑے بیٹے کا نام صلاح تھا، آخر میں اس نے ترکی خاتون خدیجہ چنگیز سے شادی کا ارادہ کیا تھا، تاکہ اس شادی کی بنیاد پر اسے ترکی کی شہریت مل جائے، کیونکہ محمد سلمان کے انداز حکومت وسیاست پر اس کی تنقیدوں کی وجہ سے سعودی عرب میں اس کا عزت کے ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا، وہ اس شادی کے سلسلہ میں بعض دستاویز پر سعودی کونسلیٹ کی مہر تصدیق حاصل کرنے کیلئے کونسلیٹ کے اندر داخل ہوا، اور پھر کبھی اس عمارت سے باہر نہیں نکل سکا، زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا، شک کی تمام سوئیاں محمد بن سلمان کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔ وہ ۲/اکتوبر کی تاریخ تھی، استنبول میں سعودی کونسل خانے کو یہ اطلاع تھی کہ جمال خاشقجی آنے والے والا ہے، اور کونسل خانہ کے ذریعہ سعودی ارباب حکومت تک بھی یہ راز افشا ہوگیا تھا، ۱۵/کی تعداد میں ریاض سے سیکوریٹی پولیس کے لوگ ۲/طیاروں میں بیٹھ کر استنبول پہونچے اور کونسل خانہ کے اندر اس وقت داخل ہوئے جب جمال خاشقجی اندر پہونچ چکا تھا، ترکی حکومت کی سیکوریٹی کی طرف سے عمارت سے باہر سی سی کیمرے لگے ہوئے تھے، کیمرے نے جمال خاشقجی کا اندر جانا ریکارڈ کرلیا، اندر کی جانب سعودی کونسل خانہ کی طرف سے جو سی سی کیمرے لگے تھے، وہ صرف اسی دن بند کردیئے گئے تھے، کسی بڑے

واقعہ کی تیاری کیلئے۔ جمال خاشقجی کی منگیتر عمارت کے باہر انتظار کرتی رہی، اور ۱۱ر گھنٹے گذر گئے اور جمال خاشقجی باہر نہیں آئے تو منگیتر کو شک گذرا، اس نے پولیس کو خبر کی، تو اندر کے ملازموں نے کہا کہ خاشقجی آئے ضرور تھے، مگر ۲۰ر منٹ کے بعد وہ واپس چلے گئے تھے۔

شہزادہ گلفام صحافی جمال خاشقجی سے بہت برہم رہا کرتے تھے، کیونکہ خاشقجی صرف واشنگٹن کا کالم نگار نہیں تھا بلکہ سعودی عرب میں صحافت کے میدان میں شاید ہی کسی نے اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں، جتنے اس صحافی نے انجام دیئے تھے، جب افغانستان میں روس کے خلاف جنگ کا معرکہ گرم تھا، اس نے میدان جنگ سے سعودی اخبارات کیلئے رپورٹنگ کی تھی، وہ الجزائر، کویت، سوڈان اور مشرق وسطی میں رہ کر انگریزی اخبارات کیلئے رپورٹر کا فرض انجام دیتا تھا، وہ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۳ء تک انگریزی اخبار ''عرب نیوز'' کا ایڈیٹر رہ چکا تھا، ۲۰۰۴ء میں وہ ''صحیفۃ الوطن'' کا ایڈیٹر بن گیا، اس کے بعد لندن پھر واشنگٹن میں سعودی سفیر الامیر ترکی الفیصل کے میڈیا ایڈوائز رکی حیثیت سے اس نے کام کیا۔ اس نے صحافت کے میدان میں کام کرتے کرتے دنیا کی کئی مشہور شخصیتوں سے انٹرویو لئے، ان میں اسامہ بن لادن کا نام بھی ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی اور اخوان المسلمون کے سلسلہ میں سعودی عرب کی جو غیر حکیمانہ پالیسی رہی، اس پر بھی اس نے تنقیدیں کیں، وہ بے لاگ حق کا صحافی تھا، وہ قلم کا دھنی اور دل کا غنی تھا، اس کی متاع فکر ونظر میں کہیں حرص وطمع کی آمیزش نہیں رہتی تھی، ولید بن طلال نے جب عرب نیوز چینل بنایا تھا تو جمال خاشقجی کو اس کا ڈائیریکٹر بنایا گیا تھا۔ جمال خاشقجی سعودی عرب کا عظیم صحافی تھا، لیکن وہ شہزادہ محمد بن سلمان کی طفلانہ حرکتوں کو اور غیر حکیمانہ پالیسی کو ناپسند کرتا تھا، اس نے پوری جرأت اور بیباکی سے ان پر تنقیدیں کی تھی، اس لئے ان کو انتقام کا نشانہ بنالیا گیا۔ کیونکہ سعودی عرب میں نہ آزادی ہے نہ جمہوریت، نہ کسی کو اختلاف کرنے کا کوئی حق، وہاں کے سارے عوام بے زبان جانوروں کی طرح زندگی گذارتے ہیں، ان کو کھانے پینے کا راتب مل جاتا ہے، اس سے زیادہ کے وہ حق دار نہیں، ان کے لبِ اظہار پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں۔ آل سعود حکومت کرنے کا استحقاق کھو چکے ہیں۔

مختلف ذرائع سے کچھ مصدقہ اور غیر مصدقہ خبریں ملی ہیں، اور بعض نامعلوم ذرائع سے ایسی آوازوں کی ریکارڈنگ موجود ہے، جس میں جمال خاشقجی کی دلدوز چیخ سنائی دیتی ہے، کہا گیا ہے جمال خاشقجی کے ہاتھ میں جو گھڑی تھے اس میں رکارڈنگ کا آلہ موجود تھا۔ خبریں یہ ہیں کہ سعودی سیکوریٹی پولیس کے لوگ جن میں محمد بن سلمان کے باڈی گارڈ بھی تھے جو خصوصی طیارے سے پہونچے تھے، انہوں نے جمال خاشقجی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، اور پھر اسے ایک صندوق میں بھرا، اور پھر وہ صندوق کونسلر کے گھر پہونچایا گیا، اور اس کے پائیں باغ میں جمال خاشقجی کی مثلہ کی ہوئی لاش کو دفن کر دیا گیا، اور سعودی سیکوریٹی کے لوگ فوراً ترکی سے باہر روانہ ہوگئے، ایک حق گو صحافی کو قلم کی بیباکی کے جرم میں زمین میں دفن کر دیا گیا، اور شہزادہ گلفام داد عیش دینے کیلئے اور سرزمین حرم کو بدنام کرنے کیلئے، زمین پر موجود ہے۔ جسے سزا ملنی چاہئے تھی وہ زندہ ہے، اور جسے زندہ رہنا چاہئے تھا وہ مردہ ہے۔

دل صاحب انصاف سے، انصاف طلب ہے

سعودی حکومت جرم کی پردہ پوشی کے لئے جھوٹ پر جھوٹ بولتی رہی۔ پہلے اس نے کہا کہ جمال خاشقجی قونصل خانہ میں

داخل ہوئے تھے اور پھر وہ واپس چلے گئے تھے۔لیکن مشکل یہ تھی کہ جمال خاشقجی کا قونصل خانہ میں داخل ہونا ثابت ہے اور عمارت پر لگے ہوئے کیمرے میں اس کا عکس موجود ہے لیکن کیمرے اس کا واپس جانا نہیں دکھاتے ہیں۔سعودی حکومت کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔مجبور ہوکر سعودی حکومت نے اپنا بیان بدلا اور کہا کہ قونصل خانہ میں بحث وجدال میں جمال خاشقجی اور سعودی اشخاص کے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی جس کی وجہ سے خاشقجی کی موت ہوگئی اور یہ قتل غیر عمد کا معاملہ ہے۔سوال یہ ہے کہ لاش کو پھر کیوں چھپایا گیا اور پولیس کو کیوں خبر نہیں کی گئی۔ترکی کے صدر رجب طیب اردغان نے مطالبہ کیا ہے کہ ۱۸/اشخاص کو جو قتل میں ملوث ہیں ترکی کے حوالہ کیا جائے تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جاسکے،ان میں پندرہ اشخاص تو وہ ہیں جو بارادہ جرم قتل سعودی عرب سے آئے تھے اور تین قونصل خانہ کے افراد ہیں۔ترکی کا کہنا ہے کہ چونکہ جرم استنبول میں ترکی میں کیا گیا ہے اس لئے اس پر مقدمہ کی کاروائی بھی ترکی میں ہونی چاہئے ، یہی قانون ہے ۔اور انصاف کا یہی تقاضا ہے۔رجب طیب اردغان نے واضح طور پر کہا کہ اس کی تحقیق ہونی چاہئے کہ کس کے حکم اور کس کے اشارہ پر یہ قتل کیا گیا ہے۔سعودی سیکوریٹی کے لوگ اور پرنس کے باڈی گارڈ از خود یہ جرم کرنے کے لئے چارٹر طیاروں میں بیٹھ کر نہیں آسکتے ہیں۔سعودی عرب کا دعوی ہے کہ قرآن مملکت کا دستور ہے۔اگر ایسا ہے تو قاتل کی وہی سزا ہونی چاہئے جو قرآن میں مذکور ہے یعنی قصاص۔

یادش بخیر ، پاکستان میں ضیاء الحق کے زمانے میں بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی،بھٹو کا جرم یہ تھا کہ اس نے اپنے کسی مخالف کے بارے میں، اپنے قریبی لوگوں کو یہ حکم دیا تھا Annihilate him یعنی اسے مار ڈالو،بھٹو کا یہ حکم عدالت میں ثابت ہوگیا تھا، چنانچہ بھٹو کو پھانسی کی سزا دی گئی ،اب اگر عدالت میں پورے طور پر یہ ثابت ہوجائے کہ محمد بن سلمان نے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا تو بطور قصاص محمد بن سلمان کو پھانسی پر چڑھا دینا چاہئے ،انصاف کا تقاضا یہی ہے۔شریعت کا یہی حکم ہے۔''شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن''۔

حیرت بالائے حیرت تو امام حرم شیخ سدیس پر ہے جنہوں نے تملق وچاپلوسی کے تمام رکارڈ توڑ ڈالے اور محمد بن سلمان کی تعریف میں وہ الفاظ استعمال کر ڈالے جو حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر کے لئے استعمال کئے تھے۔اگر امت کے اندر غیرت وحمیت کی کوئی رمق باقی ہے تو اس کے افراد ایسے امام کے پیچھے نہ نماز پڑھنا پسند کریں گے نہ اس کی تلاوت سننا گوارا کریں''ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر'' سعودی عرب نے اسلام کو بہت بدنام کیا ہے، دنیا سعودی عرب کو حرمین کی سرزمین کی وجہ سے اسلام کی نمائندگی کرنے والا ملک سمجھتی ہے، اور اسلام کی نمائندگی کرنے والے ملک میں ناانصافی ہو،ظلم ہو، انسانی حقوق کی پامالی ہو، استبدادی نظام قائم ہو،عوام کی آزادی سلب کرلی جائے، ملک کے خزانہ کو ذاتی جاگیر بنالیا جائے تو ایسی حکومت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہوجاتا ہے۔سعودی عرب کیلئے پورے عالم اسلام میں رائے عامہ کی تشکیل ہونی چاہئے ،اور علماء کو چاہئے کہ وہ حق بات کہنے میں کسی کے مفاد کا اور لومۃ لائم کا خیال نہ کریں۔

سعودی عرب کے احوال تفصیل کے ساتھ جاننے کے لئے مضمون نگار کے قلم سے کریسنٹ پبلیکیشن بلی ماران دہلی ۶ سے شائع کردہ کتاب''حرم کا پیر'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

☆☆☆

❑ قرآنیات

قرآن کریم سب سے قیمتی نعمت اور علمِ قرآن کی بخشش رحمتِ الٰہی کا فیض ہے

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

(مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے طالب علم اور ہمارے برادرزادے ابو ہریرہ ایوبی سلمہ کے حفظِ قرآن کی تکمیل پر مدرسہ میں ۷/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو بعد نماز مغرب دعائیہ مجلس منعقد ہوئی۔ ہماری درخواست پر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے حاضرین سے خطاب کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے اپنی تقریر کو تحریری صورت میں مرتب کر کے ''ندائے اعتدال'' کے لیے ارسال کیا، جس کے لیے ہم موصوف محترم کے بے حد شکر گذار ہیں۔ افادۂ عام کے مقصد سے ذیل میں اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

قابلِ صد مبارک باد ہیں تکمیلِ حفظ کی نعمت سے سرفراز ہونے والے عزیزم ابو ہریرہ سلمہ اور ان کے گھر والے بالخصوص ان کے عمِ محترم ڈاکٹر محمد طارق ایوبی صاحب جن کی سرپرستی و نگرانی میں انہیں یہ سعادت نصیب ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں ان میں قرآن کریم بلا شبہ سب سے قیمتی ہے۔ اس کی وجہ صاف واضح ہے کہ یہ کتابِ ہدایت وہ راستہ دکھاتی ہے جو انسان کو حقیقی کامیابی سے ہمکنار کرنے والا اور اخروی زندگی میں ابدی سکون و اطمینان نصیب کرنے والا ہے۔ بہت سی آیات کریمہ اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں۔ قرآن کے نزول کو فضلِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ (وانزل اللہ علیك الکتاب والحکمة و علّمك مالم تکن تعلم و کان فضل اللہ علیك عظیماً /النساء:۱۱۳) [اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ سب کچھ بتایا جس کا تمہیں علم نہیں تھا اور یہ تم پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے]۔ اللہ رب العزت کی جانب سے اس کے نزول کے بیان میں اس کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کا ذکر خاص ہے (تنزیل من الرحمٰن الرحیم /حٰمٓ السجدۃ:۱۔۲) [یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی جانب سے نازل کردہ کتاب ہے]۔ اور انسان کو علمِ قرآن عطا کیے جانے کو اللہ کی صفتِ رحمانیت کا فیض کہا گیا ہے (الرحمٰن علّم القرآن /الرحمٰن:۱۔۲) [رحمٰن نے قرآن کا علم عطا کیا]۔ قرآن کریم میں عام حالات میں کسی چیز کے ملنے یا کسی نعمت کے نصیب ہونے پر بہت زیادہ خوش ہونے، اترانے اور اس پر فخر و ناز سے منع کیا گیا ہے، لیکن قرآن جیسی قیمتی اور عظیم ترین نعمت پر خوب خوش ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یا ایھا الناس قد جاء تکم موعظة من ربّکم و شفاء لما فی الصدور و ھدیً و رحمة للمومنین قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلك فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون (یونس:۱۰/۵۷۔۵۸)

(اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے، یہ دلوں کے امراض کی شفا ہے اور مومنین کے لیے رہنمائی و رحمت ہے، کہہ دیجیے کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نصیب ہوئی) ہے تو چاہیے کہ وہ اس پر خوب خوش ہو جائیں، یہ [قرآن کی دولت] اس سے بہتر ہے جو [دنیا کے ساز و سامان] لوگ جمع کر رہے ہیں)

علم قرآن کی فضیلت کے لیے یہ ذکر کافی ہے کہ سورہ الرحمٰن میں علم قرآن عطا کیے جانے کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کا مظہر قرار دیا گیا اور حدیث میں علمِ قرآن سیکھنے و سکھانے والے کو سب

سے بہتر شخص سے تعبیر کیا گیا(خیر کم من تعلّم القرآن و علّمہ ، صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلّم القرآن و علّمہ)۔یہاں یہ واضح رہے کہ علمِ قرآن کے متعدد پہلو ہیں۔قرآن پڑھنا سیکھنا یعنی ناظرہ قرآن کا علم، فنِّ قراءت یا علم تجوید حاصل کرنا، حفظِ قرآن، قرآن کے معنیٰ ومفہوم کی صلاحیت پیدا کرنا یعنی فہمِ قرآن کا علم، زبانی یا تحریری طور پر قرآن کے معانی کی تشریح وترجمانی کی اہلیت پیدا کرنا۔ یہ سب علمِ قرآن کے مختلف پہلو ہیں اور ان میں سے ہرایک کی اپنے اپنے مقام پر ضرورت، اہمیت وفضیلت ہے۔قرآن کریم میں جس علمِ قرآن کی بخشش کو اللہ کی صفتِ رحمانیت کا فیض قرار دیا گیا ہے اور حدیث میں جس علمِ قرآن کے سیکھنے وسکھانے والے کو بہترین شخص کہا گیا ہے اس کا اطلاق علمِ قرآن کے تمام پہلوؤں پر ہوتا ہے جنہیں اوپر ذکر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی بابرکت وپُرعظمت کتاب ہے جس کا پڑھنا پڑھانا، سننا سنانا، حفظ کرنا وکرانا، سمجھنا وسمجھانا، لکھنا وشائع کرنا، حتیٰ کہ محض دیکھنا بھی برکت ورحمت سے خالی نہیں۔اسی ضمن میں یہ وضاحت اہمیت سے خالی نہ ہوگی کہ سورۂ فاطر میں تلاوتِ قرآن کو ایسے اعمال میں شامل کیا گیا ہے جن میں مصروف رہنے میں سراسر نفع ہے،نقصان یا خسارہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔انّ الذین یتلون کتاب اللہ واقاموا الصلوٰۃ و انفقوا ممّا رزقنٰھم سرّاً وعلانیۃً یرجون تجارۃً لن تبور (فاطر:۳۵/۳۵)[جولوگ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے ظاہر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں خسارے کا کوئی سوال ہی نہیں]۔قرآن مجید کے مقام ومرتبہ کی نسبت سے یہ ذکر نہایت اہم معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت کرنا اور معنیٰ ومفہوم کو سمجھنا تو الگ رہا اسے پڑھے جانے کے وقت خاموشی سے اسے سننا بھی موجبِ برکت ورحمت ہے۔یہ حقیقت خود اس کتاب سے عیاں ہوتی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:واذا قرء القرآن فاستمعوا لہ و انصتوا لعلکم ترحمون (الاعراف:۷/۲۰۴)[اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے]۔

قرآن کریم کی عظمت اور قدر و قیمت کا اصل راز اس کی اس بنیادی خصوصیت میں پنہاں ہے کہ یہ سارے انسانوں کے لیے ھدایت کا ذریعہ ہے(ھدیً للناس /البقرۃ:۲/۱۸۵)۔یہ کتاب وہ راہ دکھاتی ہے جو بالکل سیدھی ہے(انّ ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم/ بنی اسرائیل:۱۷/۹)۔یہ لوگوں کو گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک پہنچانے والی ہے(الر کتاب انزلنٰہ الیك لتخرج النّاس من الظلمٰت الیٰ النور (ابراہیم:۱۴/۱)۔یہ لوگوں کے رب کی جانب سے لوگوں کے لیے نصیحت اور ان کے قلبی امراض کی شفا ہے اور اہلِ ایمان کے لیے وسیلۂ ہدایت اور موجبِ رحمت ہے(یا ایھا الناس قد جاء تکم موعظۃ من ربّکم و شفاء لما فی الصدور و ھدیً و رحمۃً للمومنین / یونس:۱۰/۵۷)۔نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: علیکم بالشفائین۔العسل و القرآن (سنن ابن ماجہ، ابواب الطب، باب العسل)[تمھارے لیے دو شفا دینے والی چیزوں کا اپنانا لازم ہے: شہد اور قرآن]

قرآن مجید کی عظمت وفضیلت اور اس کے مقام ومرتبہ سے متعلق اس مختصر وضاحت سے ہم اور آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ حفظِ قرآن کس قدر باعثِ برکت، موجبِ رحمت اور وجہِ سعادتِ عمل ہے۔وہ سینہ کتنا پُرنور ہوگا جس میں یہ کتابِ نور محفوظ ہوجائے، وہ دل ودماغ کس قدر روشن ہوگا جو اس کتابِ مقدس کو یاد کرنے وسمجھنے میں ممدّ ومعاون بنے اور وہ زبان کس قدر تر وتازہ رہتی ہوگی جس پر قرآن کے الفاظ مبارکہ ہر وقت جاری رہتے ہوں گے۔ایک حدیث سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ بھی یاد کرنا دل کو آباد کرنا ہے۔ اس کے متن کی ترجمانی یہ ہے کہ جس دل میں قرآن کا کچھ حصہ بھی نہ ہو وہ بیتِ خراب (ویران وسنسان گھر) کی طرح ہے(سنن ترمذی، ابواب ثواب القرآن، باب الذی لیس فی جوفہ قرآن کالبیت الخراب)۔

حفظِ قرآن کے بہت سے فضائل اور فیوض و برکات بیان کیے

گئے ہیں، اس وقت ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ صرف ایک حدیث کے حوالے سے اس سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی یہ حدیث بہت مشہور ہے جسے آپ حضرات نے بارہا سنا ہوگا: قال رسول الله ﷺ من قرأ حرفاً من كتاب الله فله حسنة والحسنة بعشر امثالها۔ لا اقول المّ حرف ولكن الف حرف ولام حرف و ميم حرف (سنن ترمذی، ابواب ثواب القرآن، باب ما جاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن مالہ من الاجر)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اسے ایک نیکی کا ثواب ملے گا اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے، پھر آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ ''الم'' ایک حرف نہیں، بلکہ تین حروف سے مرکب ہے: الف، لام و میم۔ یعنی صرف الم پڑھنے سے تیس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ اس حدیث کے حوالے سے قابلِ غور بات یہ ہے کہ حفظ کی سعادت حاصل کرنے والے، حفظ کرتے ہوئے اسے دوہرانے والے، تکمیل کے بعد یاد رکھنے کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے اور پھر نماز میں اور دیگر مواقع پر قرآن مجید پڑھتے و سناتے ہوئے قرآن کے کتنے حروف ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور ہوں گے، ہم نہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں، نہ گن سکتے ہیں اور نہ جدید دور کا کلکولیٹر اس باب میں کچھ مدد دے سکتا ہے۔ بس یہ احساس کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت یاد آتی ہے: وان تعدّو نعمة الله لا تحصوها انّ الله لغفور رحيم (النحل: ۱۸/۱۶) [اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے، بے شک اللہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے]۔

قرآن کریم پڑھنے کے فضائل و برکات بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بلاشبہ قرآن کتابِ تلاوت، کتابِ حفظ، کتابِ ذکر، کتاب تدبر و تفکر ہے، لیکن ان سب کے ساتھ ہمیں اس کی اصل حیثیت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کتابِ عمل ہے۔ اللہ رب العزت نے مہبطِ وحی حضور اقدس ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت ہی صاف لفظوں میں اس کے نزول کا یہ مقصد واضح فرمایا ہے: الرا كتاب انزلنٰه اليك لتخرج الناس من الظلمات الى النور (ابراہیم: ۱/۱۴) [الر، یہ کتاب جو ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ]۔ قرآن کریم کو مومنین کے لیے ذریعۂ ھدایت و وسیلۂ رحمت بتایا گیا ہے (و هدىً و رحمة للمومنين (یونس: ۵۷/۱۰)، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی رحمتوں کے فیوض و برکات ہمیں صحیح معنوں میں اسی وقت نصیب ہوں گے جب ہم اس کے پیغام کو قبول کریں، اس کی نصیحت کو مضبوطی سے پکڑیں اور روزمرّہ زندگی میں اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ اس آیت سے یہی پیغام ملتا ہے: و هٰذا كتاب انزلنٰه مبارك فاتبعوه واتّقوا لعلّكم ترحمون (الانعام: ۱۵۵/۶) [اور یہ کتاب جسے ہم نے نازل کیا ہے، سراپا برکت ہے۔ پس اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے]۔ نبی کریم ﷺ نزول کے بعد قرآن کی آیات کو نہ صرف یہ کہ پڑھ کر سناتے تھے، بلکہ سب سے پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ قرآن مجید کی عملی تفسیر و تعبیر تھی۔ امّ المومنین حضرت عائشہؓ سے آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کے باب میں بعض صحابہ کے سوال کے جواب میں ان کا یہ قول آپ لوگوں نے بارہا سنا ہوگا: فانّ خلق نبى الله ﷺ كان القرآن (صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب جامع صلوٰۃ اللّیل و قصرہا) [رسول اللہ ﷺ کے اخلاق قرآن کا مجسم نمونہ تھے]۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام نے اسوۂ حسنہ کی کامل پیروی کرتے ہوئے اپنے آپ کو پوری طرح قرآن کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے الفاظ میں ان کی امتیازی خصوصیات یہ تھیں: ابرّ قلوباً و اعمق علماً و اقلّ تكلفا [دل کے سب سے زیادہ پاک، علم میں سب سے زیادہ گہرے اور تکلفات میں سب سے کم] (ابن قیم، اعلام الموقعین، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۱۷۹/۴، ۱۹۲؛ سید محمد رابع حسنی ندوی، قرآن مجید- انسانی زندگی کا رہبر کامل، دار الرشید، لکھنؤ، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰۵)۔

آخر میں قرآن کریم کے حوالے سے ایک اور پیغام دینا چاہتا

ہوں اور وہ یہ کہ ہم سب اپنے وجود کو دوسروں کے لیے نفع بخش بنائیں۔

اللہ رب العزت نے جسمانی قوت، ذہنی وعلمی صلاحیت، تقریری وتحریری استعداد، مال ودولت، ساز وسامان، عہدہ ومنصب کی صورت میں جو کچھ نعمتیں عطا کی ہیں انہیں نفع بخش بنائیں، نہ صرف اپنے وگھر والوں کے لیے، بلکہ ان سے پاس و پڑوس کے لوگوں، اقرباء واحباب، محتاجوں وضرورت مندوں اور عام لوگوں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ یہ آیت ہمیں بار بار یہی پیغام دے رہی ہے: واحسن كما احسن الله اليك (القصص:۲۸/۷۷) [اور (دوسروں کے ساتھ) احسان کرو جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے]۔ سورہ بقرہ کی آیتِ دین میں قرض یا مالی لین دین کے معاملہ کا ریکارڈ تحریری صورت میں تیار کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر اس معاملہ کو لکھنے کے لیے اسے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کرے، بلکہ خوشی دلی سے یہ کام کرے اور اس موقع پر یہ یاد رکھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنے کی صلاحیت بخشی ہے وہ بوقتِ ضرورت لکھ کر یا اس صلاحیت کو استعمال کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ متعلقہ آیت ملاحظہ ہو: ولا يأب كاتب ان يكتب كما علمّه الله فليكتب (البقرۃ:۲/۲۸۲) [اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جس طرح اللہ نے اسے (لکھنا) سکھایا ہے پس اسے چاہیے کہ وہ (اللہ کے اس فضل وکرم کو یاد کرتے ہوئے) لکھے]۔ یہ مشہور حدیث اکثر بیان کی جاتی ہے: خير الناس من ينفع الناس (منتخب کنز العمّال، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۶/۳۰۵) [تم میں بہتر وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے]۔ نفع رسانی کی نیک روش اختیار کرنے کا پیغام اسلامی ادب کے ترجمان ایک بزرگ شاعر کے اس شعر میں بڑے عمدہ اسلوب میں ملتا ہے:

کوئی بزم ہو کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا

حقیقت یہ کہ اس نیک روش کو اختیار کرنے کی بہت سی برکات ہیں۔ اس کی ایک برکت یہ ہے کہ اسے اپنا کر اسلام واہلِ اسلام کی نافعیت کو ثابت کر سکتے ہیں، اس سے ہم دوسروں کا دل جیت سکتے ہیں، معاشرتی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں اور برادرانِ وطن کی نگاہ میں محبوب بن سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دوری، نفرت اور ٹکراؤ کے موجودہ ماحول میں اس روش کو اپنانے اور فروغ دینے کی ضرورت و اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے طلبہ (جو کثیر تعداد میں اس دعائیہ مجلس میں موجود ہیں) کے لیے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ علم، بالخصوص علمِ دین بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا اکتساب اور اس میں مہارت کا حصول جد وجہد، سنجیدگی اور انہماک کا طالب ہے۔ دورِ طالب علمی میں کسی استاد کا بتایا ہوا عربی کا ایک قیمتی مقولہ اب بھی ذہن میں محفوظ ہے جسے یونیورسٹی میں تدریسی خدمات کے دوران اکثر طلبہ کو سناتا رہا ہوں اور وہ یہ ہے: العلم لا يعطيك بعضه حتّىٰ تعطيه كلّك (علم تجھے اپنا کچھ حصہ بھی نہیں دیتا یہاں تک تم اپنا سب کچھ اسے دے دو)۔ اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ تین چیزیں/خوبیاں ایسی ہیں کہ اگر کوئی اپنے آپ کو ان کا خوگر بنالے یا ان خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کر لے تو نہ صرف طالب علمی کی زندگی میں، بلکہ عملی زندگی میں ملازمت یا اور کوئی کام کرتے ہوئے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے یا چومے گی اور اسے سرخ روئی وعزت نصیب ہوتی ہے یا ہوگی۔ اور وہ ہیں: وقت کی پابندی، سنجیدگی اور ایمان داری۔

قرآن کریم کے حوالے سے ایک اور اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اس کتابِ ہدایت کا یہ بھی ایک فیض ہے کہ اس نے علم کے تصور کو بلند کیا، اس کا دائرہ وسیع کیا اور اس کا تعلق اس کے عطا کرنے والے سے جوڑا، جیسا کہ اولین نازل ہونے والی آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ان آیات میں اللہ کا نام لے کر پڑھنے اور پڑھنے ولکھنے کی صلاحیتوں کو استعمال کرتے وقت ان صلاحیتوں کو عطا کرنے والے کے فضل وکرم کو یاد کرنے کی ہدایت دی گئی ہے (العلق:۹۶/۱-۵)۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ علم کے

حصول یا اس کی ترقی کے لیے ہم (طالب علم کی حیثیت سے، استاد کی حیثیت سے یا کسی اور طور پر) چاہے جتنی کوشش کرلیں، اس میدان میں خواہ کتنی دوڑ بھاگ کرلیں ہمیں اللہ کی توفیق کے بغیر کچھ نصیب نہیں ہونے والا ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت ہر مومن کے دل کی آواز ہوتی ہے اور ہونی چاہیے: وما توفیقی الّا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب (ھود:۸۸/۱۱)[اور مجھے توفیق اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہوگی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کے طرف میں رجوع کرتا ہوں]۔ ایک عارف باللہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سب کچھ اسی ذاتِ رحیم وکریم کے فضل وکرم سے ملتا ہے، اسی طرح علم جیسی قیمتی دولت بھی اسی کی عنایت سے میسر آتی ہے، اس لیے علم طلب کرنے والوں کو اس راہ میں جد وجہد اور تگ و دو کے ساتھ اللہ سے رجوع کرتے رہنا چاہیے، اس نعمت کی طلب کے لیے ربِّ کریم سے توفیق مانگتے رہنا چاہیے اور اس میں اضافہ کے لیے دستِ دعا دراز کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بھی اللہ رب العزت کی بے پایاں عنایت کا ایک حصہ ہے کہ اس نے ہمیں اپنی کتابِ عزیز وعظیم کے توسط سے علم میں ترقی کے لیے دعا مانگنے کے کلمات بھی تلقین کردیے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں: وقل ربِّ زدنی علما (طٰہٰ:۱۱۴/۲۰)[اور کہو (دعا کرو)[اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما]۔

آخری بات یہ کہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ اور دیگر دینی اداروں کے طلبہ کو چاہیے کہ وہ کبھی بھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں، وہ اس علم کی قدر وقیمت کو پہچانیں جس کے حصول میں وہ مصروف ہیں اور اس تعلیم کی ضرورت واہمیت ہمیشہ اپنی نگاہوں میں رکھیں جس کے فیوض وبرکات سے وہ اس وقت خود مستفیض ہورہے ہیں اور فراغت کے بعد ان شاء اللہ دوسروں کو بھی اس سے فیض یاب کریں گے۔ یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے نہیں اوجھل ہونی چاہیے کہ جدید تعلیم کے میدان میں بے پناہ پیش رفت اور تمام تر ترقیات کے باوجود معاشرہ کو ان علوم کی ضرورت ہے جن کے اکتساب میں وہ سرگرداں ہیں، بلکہ یہ کہنا خلافِ واقعہ نہ ہوگا کہ جدید تعلیم کے حصول وفروغ کی نسبت سے عصرِ حاضر میں مسابقت یا مقابلہ آرائی کی صورتِ حال میں دینی تعلیم کی ضرورت وافادیت اور اس کے فیض یافتگان کی طلب اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ مدارس کی تعلیم سے فیض یاب ہوتے ہوئے دینی امور اور اخلاق وکردار کے تعلق سے جو تربیت پارہے ہیں اس سے ان کی ایک شناخت بن رہی ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اس کی قدر کرنا اور اسے ہر حال میں برقرار رکھنا اس تعلیم کا تقاضا ہے جس سے وہ بہرہ ور ہوئے ہیں۔ یہ ان کا ایک اہم فریضہ ہے جس سے انہیں بہرصورت عہدہ برآ ہونا ہے۔ مدرسہ کے موجودہ تعلیمی مرحلہ کی تکمیل کے بعد آپ عملی زندگی میں قدم رکھیں گے، آپ میں سے بہت سے مزید اعلیٰ تعلیم کی طلب میں آگے بڑھیں گے، اس علمی طلب میں کچھ جدید جامعات کا بھی رخ کریں گے۔ آپ یقین رکھیں کہ اس نئے ماحول میں اپنی شناخت کی بقا میں آپ کی قدر افزائی ہے اور آپ کی مزید طلب ہے۔ آپ اپنے نیک اعمال، اخلاق وکردار سے دوسروں کو متاثر کرسکتے ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ کریں گے تو آپ کا مقام ومرتبہ اور بلند ہوگا اور آپ کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوگا اور آپ کے مدرسہ کی نیک نامی ہوگی۔ لیکن اگر آپ نے متاثر کرنے کے بجائے دوسروں کے برے اثرات کو قبول کیا تو آپ نے خود اپنے آپ کو اپنے مقام سے گرایا، اپنی بلند حیثیت کو مجروح کیا اور اپنے ادارے کے نام پر دھبّہ لگایا۔ یاد رکھیں کہ آپ کی عزت وقدردانی دینی تعلیم وتربیت کے فیض یافتہ کی حیثیت سے آپ کی شناخت کی بقا میں ہے، نہ کہ اس سے دست بردار ہونے میں، جیسا کہ مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد بعض طلبہ اس نہج پر سوچتے ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں دین وعلمِ دین کی خدمت کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆

❑ قرآنیات

تفسیر موضوعی اور نصابی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت

مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
مدیر: معہد الامام أبی الحسن الندوی للدعوۃ والفکر الاسلامی، لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام علىٰ محمد بن عبد الله الأمين وعلىٰ آله وصحبه ومن تبعهم باحسان الىٰ يوم الدين ، وسلم تسليما كثيرا كثيرا ، أما بعد !

قرآن مجید کلام الٰہی اور معجزۂ ربانی ہے، وہ وحی الٰہی پر مرتب محیر العقول ایک کامل ومکمل نظام زندگی ودستور حیات ہے، وہ ہدایت کا صحیفہ بھی ہے اور قیام عدل ومیزان کی شمشیر آبدار بھی، فتن ودجالیت سے حفظ وامان کی ضمانت بھی ہے اور گنجینۂ علم ومعرفت بھی، زبان نبوت نے ایک موقع پر فرمایا تھا :

عن علي رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : انها ستكون فتن . قلت ما المخرج منها يا رسول الله ؟ قال : كتاب الله ، فيه نبأ ما قبلكم ، وخبر ما بعدكم ، وحكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ، ومن اتبع الهدى بغيره أضله الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، هو الصراط المستقيم ، وهو الذي لا تزيغ به الأهواء ، ولا تلتبس به الألسن ، ولا تنقضي عجائبه ، ولا يشبع منه العلماء ، من قال به صدق ، ومن عمل به أجر ، ومن حكم به ، عدل ومن دعا إليه هدي إلى صراط مستقيم. (رواه الترمذى.)

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، عنقریب فتنے رونما ہوں گے، میں نے عرض کیا ان سے نکلنے کا راستہ کیا ہے، آپ نے فرمایا، کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلے لوگوں کے واقعات اور آئندہ کی پیشین گوئیاں ہیں، وہ تمہارے درمیان معاملات کا حَکَم ہے، وہ فیصلہ کن ہے، کوئی مذاق نہیں، جو اس کو کبر وغرور سے چھوڑے گا اللہ اس کو توڑ کر رکھ دے گا، جو اس کے بغیر ہدایت کو تلاش کرے گا اللہ اسے گمراہ کردے گا، وہ ذکر حکیم ہے، وہ صراط مستقیم ہے، وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، وہ ایسی کتاب ہے، جس کے ذریعہ خواہشات زیغ وضلال کا شکار نہیں ہوتیں، جس کے ذریعہ زبانیں دروغ گوئی نہیں کرتیں، جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے، جس کے ذریعہ اہل علم کو سیرابی نہیں ہوتی، جو اس کے ذریعہ کہتا ہے وہ صادق ہے، جو اس پر عمل کرتا ہے وہ مستحق اجر ہے، جو اس کے ذریعہ فیصلہ کرتا ہے وہ اس کا فیصلہ عین انصاف ہے، جو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی توفیق ملتی ہے۔

آج تمام اقوام عالم کے درمیان امت اسلامیہ کا یہ امتیاز ہے کہ اس کے پاس خدا کی آخری کتاب اسی طرح بے کم وکاست محفوظ ہے جس طرح وہ نازل ہوئی تھی، اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خداوند قدوس نے لی ہے ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ''(الحجر:۹) قرآن مجید کی نوع بہ نوع پہلوؤں سے بے شمار خدمات ہوئی ہیں، لاتعداد تألیفات وکتب قرآن کریم اور اس سے متعلق علوم پر وجود میں آئیں، تفسیری خدمات ہوئیں۔

تفسیر قرآن کے مختلف مناہج واسالیب رہے ہیں، جن میں بنیادی طور پر ''تفسیر مأثور'' اور ''تفسیر بالرأی'' معروف ہیں، تفسیر کے باب میں زیادہ صحیح، درست اور محفوظ طریقہ ''تفسیر مأثور'' ہی ہے یعنی قرآن پاک کے معانی، شرح وتفسیر کے لئے خود قرآن کریم حضور ﷺ کے اقوال واحادیث، اقوال صحابہ وتابعین اور اقوال أئمہ کی طرف رجوع کیا جائے؛ لیکن اس منہج کی مشکل یہ رہی ہے کہ صحیح وثابت روایات کا ذخیرہ کم اور اسرائیلیات وضعیف وموضوع روایات نے خوب شہرت حاصل کی ہے، جس کے مختلف اسباب رہے، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں :

وصار التفسير على صنفين : تفسير نقلي مستند إلى الآثار المنقولة عن السلف ، وهي معرفة الناسخ والمنسوخ وأسباب النزول ومقاصد الآي ، وكل ذلك لا يعرف إلا بالنقل عن الصحابة والتابعين ، وقد جمع المتقدمون في ذٰلك و أوعوا ، إلا أن كتبهم ومنقولا تهم تشتمل على الغثّ والسمين والمقبول والمردود ، والسبب في ذٰلك أن العرب لم يكونوا أهل كتاب ولا علم ، وإنما غلبت عليهم البداو ة والأمية ، فإذا تشوّقوا إلى معرفة شيئ مما تتشوق إليه النفوس البشرية في أسباب المكونات وبدء الخليقة وأسرار الوجود ، فإنما يسألون عنه أهل الكتاب قبلهم ويستفيدونه منهم ، وهم أهل التوراة من اليهود ومن تبع دينهم من النصارى ، وأهل التوراة الذين بين العرب يومئذ بادية مثلهم لا يعرفون من ذٰلك إلا ما تعرفه العامّة من أهل الكتاب ، ومعظمهم من حمير الذين أخذوا بدين اليهودية ، فلما أسلموا بقوا على ما كان عندهم ، مما لا تعلق له بالأحكام الشرعية التى يحتاطون لها ، مثل أخبار بدء الخليقة وما يرجع إلى الحدثان والملاحم وأمثال ذٰلك ، وهؤلاء مثل كعب الأحبار ووهب بن منبه وعبد الله بن سلام وأمثالهم ، فامتلأت التفاسير من المنقولات عندهم في أمثال هذه الأغراض ، وأخبارا موقوفة عليهم ، وليست مما يرجع إلى الأحكام فيتحرّي في الصحة التي يجب بها العمل ، وتساهل المفسرون في مثل ذٰلك وملأوا كتب التفسير بهذه المنقولات. (مقدمة ابن خلدون : ۳۴۸-۳۴۹)

تفسیر بالرأی کی علماء نے دو قسمیں کی ہیں ''تفسیر بالرأی المحمود ''اور ''تفسیر بالرأی المذموم ''اگر قرآن کریم کی تفسیر رائے واجتہاد سے کی جائے تو لازم ہے کہ اس میں ظواہر نصوص سے عدول نہ ہو، قواعد لغت اور منہج سلف سے انحراف اور نصوص قرآن وسنت سے ٹکراؤ نہ ہو، اگر ایسا نہیں ہے اور اگر وہ شرائط--- جو علمائے اُصول نے رائے کے معتبر ہونے کے ذکر کئے ہیں--- مفقود ہوں تو وہ رائے مذموم ہے، ایسی ہر رائے اور اجتہاد سے تفسیر بیان کرنا جائز نہیں ہے، فرمان نبوی ﷺ ہے: ''من قال في القرآن برأيه وأصاب فقد أخطأ ''(سنن الترمذی:۲۹۵۲، عن جندب بن عبداللہؓ) جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے اور اجتہاد سے کوئی بات کہی اور اتفاق سے وہ صحیح بھی ہو تو وہ غلط ہے، اس لئے کہ اس نے غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔

بہر حال تفسیر کے مختلف مناہج قدماء کے یہاں ملتے ہیں، مجھے یہاں ان سب کا ذکر مقصود نہیں، یہاں مختصر تفسیر موضوعی کا تعارف ،واہمیت مقصود ہے، جو ذیل کی سطور میں ذکر کیا جارہا ہے۔

تفسیر موضوعی:

قرآن مجید کی تفسیر کے مختلف مناہج میں ایک منہج تفسیر موضوعی بھی ہے، اس کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

''تفسیر موضوعی'' یہ اصطلاح دو کلمات سے مرکب ہے، ایک

''تفسیر'' دوسرے ''موضوعی'' ان کا مطلب کیا ہے؟ تفسیر کے لغوی معنی ''توضیح وبیان'' کے ہیں :

التفسیر من الفسر وهو الكشف والبيان ، قال الراغب : اظهار المعنى المعقول . (مفردات القرآن : ۵۷۱)

تفسیر کی اصل ''فسر'' ہے جس کے معنی وضاحت وبیان کے ہیں، راغب اصفہانی کہتے ہیں، کسی معنی معقول کے اظہار کا نام تفسیر ہے۔

مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر کہتے ہیں :

علم يكشف به عن معاني آيات القرآن و بيان مراد الله تعالىٰ منها حسب الطاقة البشرية .

لفظ '' موضوعی'' کی اصل ' وضع '' ہے جس کے معنی ہیں ''الوضع : جعل الشيئ في مكان ما ''یعنی کسی شئے کو کسی جگہ رکھنا، موضوع اسم مفعول کا صیغہ ہے، یعنی: ''رکھا ہوا، وضع کیا ہوا'' اسی معنی میں ایک شاعر کا شعر ہے :

بادشاہی کے بھی سامان کو درکار ہیں داغ
مورچھل کے لئے موضوع ہوئے مور کے پر

موضوع کا مطلب ''مدعا یا مضمون'' بھی ہوتا ہے، اسی طرح ''اصل مقصود جس سے کسی علم بحث کریں، یا وہ شئے جس کا ذکر اس علم میں ہو موضوع کہلاتا ہے، علم تفسیر وقرآنیات کے باب میں موضوع سے مراد ہے :

قضية أو أمر متعلق بجانب من جوانب الحياة في العقيدة أوالسلوك الاجتماعي أو مظاهر الكون تعرضت لها آيات القرآن الكريم . (مباحث فی التفسير الموضوعي ، ڈاکٹر مصطفى مسلم : ۱۶)

یعنی کوئی ایسا معاملہ یا کوئی ایسا قضیہ جس کا تعلق حیات انسانی کے کسی گوشے عقیدہ یا معاشرت واخلاق یا مظاہر کائنات سے ہواور قرآنی آیات نے ان سے تعرض کیا ہے۔

موضوعی مطالعہ Objective Studies سے مراد وہ تحقیقات ہوتی ہیں، جن میں کسی خاص مضمون وعنوان سے بحث وتحقیق ہوتی ہے، اس روشنی میں معاصر مفکرین نے تفسیر موضوعی کی جو تعریفات ذکر کی ہیں، ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں :

۱- هو بيان ما يتعلق بموضوع من موضوعات الحياة الفكرية أو الاجتماعية أو الكونية من زاوية قرآنية للخروج بنظرية قرآنية بصدده .

تفسیر موضوعی سے مراد یہ ہے کہ فکری، معاشرتی موضوع، یا کائنات سے متعلق مضامین کا قرآنی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے؛ تاکہ اس کے بارے میں قرآن کا نظریہ واضح ہو :

۲- هو جمع الآيات المتفرقة فى سور القرآن الكريم المتعلقة بالموضوع الواحد لفظا أو حكما وتفسيرها حسب المقاصد القرآنية .

قرآن مجید کی مختلف سورتوں سے ان آیات کو جمع کرنا جو لفظی یا حکمی لحاظ سے متحد ہوں اور ان کی تفسیر قرآنی مقاصد واہداف کے مطابق کرنا۔

۳- هو بيان موضوع ما من خلال آيات القرآن في سورة واحدة أو في سور متعددة .

کسی خاص موضوع کی تشریح قرآنی آیات کی روشنی میں کرنا، خواہ ایک سورت میں ہوں یا متفرق سور میں۔

۴- هو علم يبحث فى قضايا القرآن الكريم المتحدة معنى أو غاية عن طريق جمع آياتها المتفرقة والنظر فيها على هيئة مخصوصة بشروط مخصوصة لبيان معناها واستخراج عناصرها وربطها برباط جامع.

تفسیر موضوعی سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعہ ان مضامین قرآن کا مطالعہ جو بلحاظ معنی ومقصد متحد ہوں، مختلف آیات کو جمع کرکے، ان میں مخصوص طریقہ سے، تفسیر کے مخصوص شرائط کے ساتھ کیا جائے، آیات کے مضامین وعناصر کا استخراج اوران کے

مابین ربط وہم آہنگی کو بیان کیا جائے۔

۵- هو علم يتناول القضايا حسب المقاصد القرآنية من خلال سورة أو أكثر .

اس تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔(المدخل إلی التفسیر الموضوعی: ۲۰، ودراسات فی التفسیر الموضوعی: ۷، دزعواض زاھر)۔

یہ تفسیر موضوعی کی مختلف تعریفات ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ :

۱- ایک موضوع سے متعلق آیات قرآن کو جمع کرنا اور ان آیات کے مابین ربط وانسجام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی مقاصد کی روشنی میں ان کی تفسیر کرنا۔

۲- قرآن کریم کی کسی ایک سورت کے اساسی مضمون محور وہدف کی روشنی میں اس سورت کی تفسیر کرنا اوران تمام مضامین ومشتملات کی تفسیر اس محور اساسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرنا، خواہ سورت مختصر ہو جن کے اندر عموما ایک ہی محور ومضمون ہوتا ہے، یا طویل سورت ہو جن میں ایک سے زائد مضامین ومحاور ہوتے ہیں۔

۳- کسی ایک عنوان کے تحت آیات قرآن کا جمع وتتبع، ان کی تشریح وتفسیر، مفردات وکلمات کا تتبع اور مختلف آیات وسور میں ان کی مختلف دلالتوں کا مطالعہ بھی تفسیر موضوعی کی قسم ہے۔

وہ تفاسیر جن کا تعلق آیات احکام کی تشریح سے ہے، بالفاظ دیگر فقہی تفاسیر بھی "تفسیر موضوعی" ہی کی ایک قسم ہیں؛ کیوں کہ ان میں قرآن مجید کے خاص مضامین کی تشریح ہوتی ہے۔

تفسیر موضوعی پر ایک نظر

تفسیر موضوعی کا منہج واُسلوب اوراس کے عناصر ومؤلفات اگر دیکھا جائے تو زمانۂ قدیم سے ہی معروف ومتداول ہیں، تاہم یہ اصطلاح عصر قدیم میں رائج نہیں تھی ، باقاعدہ اس اصطلاح کا استعمال اس وقت رائج ہوا جب چودھویں صدی میں جامعہ ازہر قاہرہ کے کلیۃ اصول الدین کے شعبۂ تفسیر میں "تفسیر موضوعی" کا نصاب شامل کیا گیا۔(محاضرات فی التفسیر الموضوعی ص:۱۷)۔

اگر ہم تاریخ تفسیر اور مؤلفات تفسیر کا جائزہ لیں تو تفسیر موضوعی کا مواد قدماء کے یہاں بھی مختلف مراحل ومختلف اسالیب میں ملتا ہے، جس کی قدرے وضاحت ذیل کی سطور میں پیش کی جارہی ہے :

۱- ایک مضمون یا موضوع سے متعلق آیات کا تتبع اوران کے مختلف معانی ودلالات پرغور وتدبر، بالفاظ دیگر ایک آیت کی روشنی میں دوسری آیات کے مضامین کی معرفت وفہم شرح وتفسیر بھی موضوعی تفسیر کی ایک قسم کہی جاسکتی ہے، یہی وہ منہج وقسم ہے جس کو علماء نے "تفسیر القرآن بالقرآن" کہا ہے، یہ منہج عہد نبوی ﷺ وعہد صحابہ میں معروف تھا، بعض آیات کی شرح وتفسیر کے فہم میں جب دشواری ہوئی تو حضور ﷺ نے صحابہ کے لئے قرآن کریم کی دوسری آیت کے ذریعہ شرح فرما کر اس اشکال کو رفع فرمادیا، صحیحین کی روایت میں عبداللہ بن مسعود ؓ سے منقول ہے :

عن عبد الله بن مسعود : لما نزلت هذه الآية : " الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم " شقّ ذٰلک على الناس ، فقالوا : يارسول الله ! أينا لم يظلم نفسه ؟ قال : " إنه ليس الذي تعنون ، ألم تسمعوا ما قال العبد الصالح : إن الشرک لظلم عظيم "(رواه الشيخان)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت "الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم" نازل ہوئی، لوگوں پر یہ بات بڑی شاق ہوئی، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم میں سے کون ہے، جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا، آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، یہاں ظلم سے وہ مراد ہے جو اللہ نے نیک بندے لقمان نے کہا تھا "إن الشرک لظلم عظيم" آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "مفاتح الغیب" کے بارے میں جس کا ذکر قرآن کی آیت "وعندہ مفاتح الغیب" میں ہے فرمایا :

مفاتح الغيب خمس : إن الله عنده علم الساعة وينزل الغيث ويعلم ما في الأرحام ، وما تدرى نفس ما ذا تكسب غدا ، وما تدرى نفس بأى أرض تموت إن الله عليم خبير .

علمائے اصول نے یہ قاعدہ لکھا ہے کہ تفسیر قرآن کا اولین مآخذ خود قرآن ہی ہے''القرآن يفسر بعضه بعضا ''اگر قرآن میں ایک جگہ کسی موضوع پر اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل ، اگر اطلاق ہے تو تقیید موجود ہے، امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

ان أصح الطرق في ذلك -- أي في تفسير القرآن -- أن يفسر القرآن بالقرآن ، فما أجمل في مكان فانه قد فسر في موضع آخر ، وما اختصر في مكان فقد بسط في موضع آخر .

چنانچہ تفسیر القرآن بالقرآن جس میں کسی آیت کی تفسیر کے لئے اسی مضمون کی آیات کی طرف رجوع ہو یہ بھی تفسیر موضوعی ہی کی ایک شکل ہے۔

۲- اسی طرح عصر قدیم میں فقہاء نے آیات احکام کا تتبع اور ایک موضوع سے متعلق آیات کو اپنی فقہی کتب میں یکجا جمع واستنباط کا اہتمام کیا ہے؛ چنانچہ بعض فقہاء نے فقہی ابواب طہارت عبادت معاملات وفرائض وغیرہ سے متعلق آیات احکام اوران کی تشریح کو علاحدہ علاحدہ متعلقہ ابواب میں ذکر کیا ہے، اس اُسلوب کو بھی ہم ''موضوعی'' کہہ سکتے ہیں۔

۳- تاریخ تفسیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن سے متعلق موضوعی تحقیقات کا ایک اور طرز واُسلوب قدماء کے یہاں تھا، وہ الفاظ قرآن کی لغوی بحث وتحقیق اور مفردات قرآن کے مختلف معانی ودلالت کی تحقیق سے متعلق تھا؛ چنانچہ ایک ہی لفظ کی مختلف آیات وسور میں سیاق کے لحاظ دلالت مختلف ہے، الگ الگ سیاق میں اس کے معنی ودلالت کی تحقیق بھی موضوعی تفسیر ہی کی ایک شکل تھی، اس فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

سب سے پہلے مقاتل بن سلیمان (متوفی: ۱۵۰ھ) نے ''الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم''لکھی اس میں ان کلمات قرآن کو جمع کیا جن کی اصل ایک ہے مگر سیاق کلام کے لحاظ سے دلالت مختلف ہے، ان کے بعد یحییٰ بن سلام (متوفی:۲۰۰ھ) نے''کتاب التصاریف'' لکھی ، مفردات القرآن پر سب معروف ومتداول تصنیف راغب اصفہانی (متوفی:۵۰۲ھ) کی ہے، جس میں قرآنی مفردات کے مادے کا تتبع اور مختلف آیات میں اس کی دلالت ومعنی کا جامع بیان ہے۔

اسی طرح ابن الجوزی (متوفی:۵۹۷ھ) کی''نزهة الأعين النواضر فى علم الوجوه والنظائر ''دامغانی (متوفی: ۴۷۸ھ) کی''اصلاح الوجوه والنظائر فى القرآن الكريم ''فیروز آبادیؒ (متوفی:۸۱۷ھ) کی''بصائر ذوى التمييز فى لطائف الكتاب العزيز ''ابن العماد (متوفی: ۸۸۷ھ) کی''كشف السرائر فى معنى الوجوه والأشباه والنظائر ''اسی فن کی چند تالیفات ہیں، ان تمام کتب میں لغوی بحث وتحقیق کا رنگ غالب ہے۔

ان کے علاوہ قدماء کی تالیفات میں قرآنیات سے متعلق ایک طرز ان آیات کے جمع وتفسیر کا تھا جن کے مابین کوئی موضوعی ربط وہم آہنگی ہے، مثلاً أبوعبید قاسم بن سلام (متوفی :۲۷۶ھ) کی ''تأويل مشكل القرآن''جصاص رازی حنفیؒ کی'' احكام القرآن ''الماوردیؒ (متوفی:۴۵۰ھ) کی''أمثال القرآن'' عز بن عبدالسلامؒ (متوفی:۶۶۰ھ) کی''مجاز القرآن ''ابن القیم (متوفی:۷۵۱ھ) کی''أقسام القرآن وأمثال القرآن ''ہیں یہ وہ کتب ومؤلفات تھیں جن میں ان آیات کے جمع وتفسیر وتشریح کا اہتمام کیا گیا تھا جن میں کسی پہلو سے موضوعی یکسانیت تھی۔

عصر جدید کے مادی انقلاب نے جب چودھویں صدی کی دہلیز

پر قدم رکھا تو سائنس وٹکنالوجی کے میدانوں میں نئی اکتشافات کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کے نئے ابواب بھی کھلے، جدید اسالیب وجود میں آئے، تمدن ومعاشرت کے جدید مسائل سامنے آئے، ایسے میں اسلام سے شکست کھائی ہوئی صلیبیت کے انتقامی جذبہ نے علم وتحقیق کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے عقیدہ اوران کے مصادر پر ان کے یقین میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے میدان کارزار میں قدم رکھا ؛ چناچہ ''استشراق'' کے خوبصورت عنوان سے اسلام دشمن عناصر نے قرآنی مفاہیم، اخلاق و اقدار، سیرت نبوی واسلامی روایات پر اپنے تیر ونشتر استعمال کئے، مستشرقین کی معاندانہ فکر گستاخ اور مکر وفتنہ نے اسلامی ذخیرہ کا مطالعہ برائے تشکیک کیا، اس طرح ایک زبردست فکری وثقافتی جنگ کا بگل بجایا گیا، اس جنگ میں عصر جدید میں برق ودخان کے علو کا کلمہ پڑھنے اور فضائے بسیط کو تسخیر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام دشمن عناصر کی کوششیں تیز ہوئیں، تو دوسری طرف علمائے حق جن کا طریق بقول اقبال یہ رہا ہے :

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انھوں نے فکر اسلامی کی بالادستی اور کتاب وسنت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے کمر کس لی، اور معاندین کی فکر وتحقیق کے تار وپود بکھیر دئے، قرآنیات کے موضوع پر ان حالات میں نئے اسالیب وجدید طرز میں آیات آفاق وانفس کی تفسیروں اور قرآن کے اعجاز کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، بے شمار موضوعات پر قرآنی ہدایات کو بیان کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ قرآن مجید ہر دور کے لئے ہدایت کا صحیفہ اور خزینہ علم ومعرفت ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ انسانی زندگی کے مسائل اور کائناتی موضوعات کے چشم کشا حقائق اس میں موجود ہیں، ڈاکٹر نورالدین عتر اپنی کتاب علوم القرآن میں لکھتے ہیں :

وكان من الطبيعي أن تتجه أنظار الجميع الى القرآن ، توجه المنحرفون الحادا وتشكيكا ، وتوجه العلماء اظهارا للحق وهداية للقرآن ، وتفسيرا صحيحا لآياته واعجازه .

ایسے ماحول میں فطری بات تھی کہ سب کی نظر قرآن کی طرف اُٹھتی ؛ چناچہ منحرفین نے الحاد وتشکیک کے لئے قرآن کو موضوع بنایا ، اور علمائے حق نے اظہار حق ، قرآنی اعجاز وہدایت کی صحیح تفسیر وتوضیح کے لئے اپنی کوششیں صرف کیں ۔ (علوم القرآن د/عتر: ص ۱۱۰)۔

ان حالات میں ان علمائے حق کی جانفشانیوں کے نتیجہ میں ایسے تفسیری منہج واسالیب وجود میں آئے، جن میں مضامین قرآن کو پیش کرنے میں جدت وابتکار بھی تھا، اسلاف کے منہج کی رعایت کے ساتھ عصر جدید کے تقاضوں سے مطابقت بھی تھی، ڈاکٹر عتر مزید لکھتے ہیں :

حتى إذا كان الربع الأخير من القرن الرابع عشر نشطت الدراسات القرآنية نشاطا عظيما وظهرت دراسات تفسيرية لبعض السور أو الجوانب كما ظهرت تفاسير متنوعة ذات مناهج مبتكرة متعددة ، فيها تجديد في عرض معاني كتاب الله يعتمد أصول التفسير ويعول على المصادر القديمة ، ويلا ئم حاجة القارى المعاصر في ضوء استقراء الحقائق العلمية ، وانجلاء الغبار عن أخطاء السابقين ، وإن كان تأثر بعضهم بأخطاء الآخرين لكن الجملة يعتمد عليها.
(علوم القرآن ص: ۱۱۲)

ان جدید ومبتکر اسالیب میں ایک اسلوب ''تفسیر موضوعی'' کا بھی ہے، قرآن گنجینۂ معرفت وخزانۂ علم الٰہی ہے، بنیادی طور اس میں جو مضامین ہیں، علمائے اصول نے ان کو منضبط کرنے کی کوشش کی ہے، خود حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم بنیادی طور پر پانچ مضامین پر مشتمل ہے، عصر جدید کے علمی انقلاب میں زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے قرآنی ہدایات کو جاننے کی طرف توجہ

مبذول ہوئی اور تہذیب وتمدن، معاشرت واقتصادیات، سماجیات و سائنس کے بہت سے موضوعات پر قرآنی دراسات وجود میں آئیں ، زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے قرآنی ہدایات کے موضوعی مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا، تو بہت سی تالیفات متفرق موضوعات پر وجود میں آئیں، مثلا :

المرأة فی القرآن ، الانسان فی القرآن ، الالوهية من خلال الآيات القرآنية ، الصبر فی القرآن ، السيرة النبوية فی القرآن ، اليهود فی القرآن ، الحيوان فی القرآن ، السماء فی القرآن .

مشہور فرانسیسی مفکر ''جون لابوم'' نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ''**تفصيل آيات القرآن الكريم** ''اس نے اپنی اس کتاب میں اٹھارہ ابواب قائم کیے ہیں، اور ہر باب کے تحت ذیلی عناوین قائم کر کے موضوع کی ترتیب کے لحاظ قرآنی آیات کو جمع کیا ہے، اس کتاب کا عربی ترجمہ فواد عبد الباقی نے کیا ہے، اس کے اٹھارہ ابواب اس طرح ہیں :

(۱) تاریخ۔ (۲) محمد ﷺ۔
(۳) تبلیغ۔ (۴) بنی اسرائیل۔
(۵) التوراۃ۔ (۶) النصاری۔
(۷) مابعد الطبیعۃ۔ (۸) التوحید۔
(۹) القرآن۔ (۱۰) الدین۔
(۱۱) العقائد۔ (۱۲) عبادات۔
(۱۳) شریعت۔ (۱۴) معاشرتی نظام۔
(۱۵) علوم وفنون۔ (۱۶) تجارت۔
(۱۷) علم تہذیب الأخلاق۔(۱۸) النجاح۔

اس کتاب کے بعض پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے، تاہم یہ کتاب موضوعی مطالعہ میں ایک مفید قدم تھا، آئندہ سطور میں تفسیر موضوعی کے مختلف اقسام پیش خدمت ہیں۔

تفسیر موضوعی کے مختلف اقسام:

تفسیر موضوعی اور اس فن کی مؤلفات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مختلف انداز واسالیب رہے ہیں، اس کی تفصیل کو ہم تین اقسام کے تحت شمار کر سکتے ہیں۔

۱- مفردات قرآن کا مطالعہ اور ان آیات کا جمع وتتبع جن میں وہ مفرد کلمہ یا اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے، آیات کے جمع واستقراء کے بعد سیاق کلام کے لحاظ سے مختلف معانی ودلالت کی تشریح وتفسیر موضوعی مطالعہ کی ہی ایک شکل ہے، قرآن مجید کے بعض مفردات مستقل اصطلاحات کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلا ''الأمۃ ، الزکاۃ، الجھاد'' وغیرہ، قدیم مؤلفین جنھوں نے مفردات القرآن یا ''الاشباہ والنظائر'' پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں الفاظ قرآن کا موضوعی مطالعہ ہے؛ لیکن قدماء کی کتابیں صرف الفاظ ومفردات قرآن کی لغوی تشریح اور مختلف آیات کے سیاق میں اس کی مختلف دلالتوں کے ذکر تک ہی محدود ہیں، ان کتابوں میں الفاظ کی مختلف دلالتوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ ان کے مابین ربط وانسجام کے بیان کا اہتمام نہیں ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مثلا لفظ ''خیر'' قرآنی مفرادت میں ایک اہم جامع اصطلاح ہے، علامہ دامغانیؒ نے ''**اصلاح الوجوه والنظائر** ''میں مادہ: (خ ی ر) کے تحت لکھا ہے ''خ ی ر: **على ثمانية أوجه ، المال ، الايمان ، الاسلام، أفضل ، العافية ، الأجر ، الطعام ، الظفر ، الغنيمة**''(۱) اس کے بعد دامغانی نے ان آیات کا ذکر کیا جن کے اندر یہ مفرد مذکورہ معانی میں استعمال ہوا ہے؛ لیکن کلمۂ ''خیر'' کے اصل معنی اور دیگر معانی کے ساتھ اس کا ربط وتعلق اور انسجام وہم آہنگی کا بیان نہیں ہے یہی طرز راغب الاصفہانی کا مفردات القرآن میں ہے، لفظ ''أمۃ'' کے تحت وہ فرماتے ہیں :

والأمة : كل جماعة يجمعهم أمر ما إما دين واحد أو زمان واحد أو مكان واحد ، وسواء كان ذٰلك

الأمر الجامع تسخيرا أو اختيارا ، وجمعها أمم ، وقوله تعالىٰ : " ومامن دابة في الأرض ولاطائر يطير بجناحيه إلا أمم أمثالكم " أى كل نوع منها على طريقة قد سخرها الله عليها بالطبع ، فهي من بين ناسجة كالعنكبوت ، وبانية كالسرفة ، ومدخرة كالنمل ، ومعتمدة على قوت وقته كالعصفور والحمام ، إلىٰ غير ذٰلک من الطبائع التي تخصص بها كل نوع ، قوله تعالىٰ : "كان الناس أمة واحدة " أي صنفا واحدا وعلى طريقة واحدة في الضلال والكفر ، وقوله : " ولوشاء ربک لجعل الناس أمة واحدة " أى في الإيمان ، وقوله " ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير " أي : جماعة يتخيرون العلم والعمل الصالح يكونون أسوة لغيرهم ، وقوله : " إنا وجدنا آبائنا على أمة " أى على دين مجتمع ، قال :

وهل يأثمن ذو أمة وهو طائع

وقوله تعالىٰ : " وادكر بعد أمة " أي : حين ، وقرئ بعد أمة بعد نسيان ، وحقيقة ذٰلک بعد انقضاء أهل عصر أو أهل دين ، وقوله : "إن إبراهيم كان أمة قانتا لله " أي قائما مقام جماعة في عبادة الله ، نحو قولهم : فلان في نفسه قبيلة ، وروي أنه يحشر زيد بن عمرو بن نفيل أمة وحدة ، وقوله تعالىٰ : " ليسوا سواء من أهل الكتاب أمة قائمة " أي : جماعة ، وجعلها الزجاج ههنا للاستقامة ، وقال : تقديره ذو طريقة واحدة ، فترک الإضمار. (المفردات فی غریب القرآن للاصفهانی)۔

۲- تفسیر موضوعی کا دوسرا طرز واُسلوب جس میں کسی خاص موضوع سے متعلق قرآنی آیات کا جمع وتتبع کرنا اور مقاصد قرآن کو ملحوظ رکھتے ہوئے تفسیر کرنا اور اس موضوع کے بارے میں قرآنی ہدایات وتوجیہات کو پیش کرنا، یہ تفسیر موضوعی کا بڑا وسیع میدان ہے؛ بلکہ مطلقاً تفسیر موضوعی سے مراد اہل علم کے نزدیک یہی طرز ہوتا ہے ، قدماء کے یہاں بھی یہ طرز رائج رہا ہے ، مثلاً ''اعجاز القرآن ، مجاز القرآن ، اُمثال القرآن ، اُحکام القرآن'' جیسی تصانیف اسی نوع کی ہیں ، عصر حاضر میں اس نوع پر بڑا کام ہوا ہے ، فکر ونظر کے نئے گوشوں اور حیات انسانی وتہذیب وتمدن کے جدید تقاضوں سے متعلق قرآنی ہدایات وتوجیہات کے موضوعی مطالعہ کی بے شمار تصانیف وجود میں آرہی ہیں ، مثلاً ''السماء فی القرآن ، الحیوان فی القرآن ، الأرض فی القرآن'' دکتور خلیل حدری کی ''منهجية التفكير العلمي في القرآن'' ضیاء الدین عتر کی '' السيرة النبوية في القرآن '' سید قطب کی ''مشاهد القيامة في القرآن الكريم '' وغیرہ بے شمار تصانیف ہیں ، راقم السطور نے بھی ''الأمة في القرآن '' اور ''أخلاق اليهود من خلال القرآن '' کے موضوع پر طالب علمانہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

۳- تفسیر موضوعی کا ایک طرز واُسلوب یہ ہے جس میں ایک سورت کے ہدف اساسی کو سامنے رکھتے ہوئے موضوعی مطالعہ ہوتا ہے ، یہ حقیقت ہے کہ ہر سورت کا کوئی نہ کوئی محور یا ہدف اساسی وبنیادی مضمون ہوتا ہے ، چھوٹی سورتوں میں عموماً ایک ہی محور ہوتا ہے ، جب کہ طویل سورتوں میں یہ محاور مختلف ہوسکتے ہیں ، سورت میں موجود دیگر مضامین اور قصص ومباحث کا بڑا گہرا ربط اس کے بنیادی مضمون سے ہوتا ہے ، اسی طرح مکی آیات کے خاص مضامین الوہیت ، رسالت ونبوت اور عقیدۂ آخرت وغیرہ ہوتے ہیں ، خاص اُسلوب ہوتا ہے ، جب کہ مدنی آیات وسور کے مضامین واُسلوب مختلف ہیں ؛ چنانچہ کسی سورت کے ہدف اساسی کی تشریح اور دیگر مضامین ومباحث کا اس کے ساتھ ربط ملحوظ ہوئے تفسیر بیان کرنا بھی تفسیر موضوعی کی ہی ایک شکل ہے۔

قدماء نے اپنی تفاسیر میں سور قرآن کی اساسیات یا اہداف ومحور

مستقل ابتدائے سورت میں بیان کرنے کا باقاعدہ اہتمام نہیں کیا ہے؛ البتہ درمیان کلام بعض اشارات اس جانب ضرور ملتے ہیں، جدید مؤلفین میں سید قطب شہیدؒ نے فی ظلال القرآن میں ہر سورت کی تفسیر سے قبل اس کی اساسیات کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے، اسی طرح اُردو میں اس کا اہتمام مولانا اصلاحیؒ نے تدبر قرآن میں کیا ہے۔

کسی سورت کے بنیادی مضمون یا اس سورت کی روشنی میں کسی خاص مضمون کے موضوعی مطالعہ کی مثال دکتور ابراہیم زید الکیلانی کی کتاب ''تصور الألوهية كما تعرضه سورة الأنعام ''یا ان ہی کی ''قضية الرسالة كما تعرضها سورة الأنعام ''دکتور محمد البھی کے رسائل بعنوان: ''التفسير الموضوعي لسور القرآن الكريم ''یا دکتور عبدالحمید طہماز کی ''العواصم من الفتن في سورة الكهف ''در مصطفیٰ مسلم کی ''القيم في سورة الكهف ''اسی نوع چند تصانیف ہیں، راقم السطور نے اس موضوع پر ''الآداب الاجتماعية في سورة النور ''اور ''الصراع بين أهل الكفر الجبارين وأهل الايمان الممتحنين ''لکھنے کی کوشش کی ہے، جو انشاءاللہ تکمیل کے مرحلے میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کے محاور واہداف پر نظر اور غور و تدبر توجیہات ربانیہ سے استفادہ کے نئے آفاق کھولتا ہے، موضوعی تفسیر کے سلسلے میں کسی سورہ کے ہدف کو جاننے کے لئے علماء نے مختلف طریقے لکھے ہیں، سورت کے نام پر بسا اوقات غور کرنے سے اس کے ہدف تک رسائی ہوتی ہے؛ کیوں کہ قرآن کی بعض سورتوں کے نام موضوعی ہیں، علامہ بقاعی نظم الدرر میں لکھتے ہیں :

أن اسم كل سورة مترجم عن مقصودها ، لأن إسم كل شيئ تظهر المناسبة بينه وبين مسماه وعنوانه الدال إجمالا على تفصيل ما فيه (نظم الدرر: ۱/۱۷-۱۹)۔

اساسیات سورت کے فہم میں اس سورت کے اہم واقعات و مشتملات قصص ومسائل کے تدبر سے بھی مدد لی جاسکتی ہے؛ لیکن ''یہ رتبۂ بلند'' ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں، اس کے لئے گہری نظر، سلامت ذوق، فہم وبصیرت اور قرآنی لطافت کا شعور وادراک، فراست ایمانی ونور تقوی کی ضرورت ہے، یہ ملکہ ان کو نصیب ہوتا ہے جن کے لئے ''نہ رازی گرہ کشا'' ہوتا ہے ''نہ صاحب کشاف'' بلکہ ان کے قلب ونظر کی شفافیت پر ''نزول کتاب'' ہوتا ہے۔

اسی طرح سورت کے اہداف ومقاصد تک رہنمائی زمانہ نزول کی معرفت سے بھی ہوتی ہے؛ کیوں کہ مکی ومدنی سورتوں کے محاور و موضوعات اُسلوب وطرز الگ الگ ہیں، علمائے اُصول نے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

علم نظم قرآن یا علم المناسبات القرآنیۃ کا بڑا گہرا ربط تفسیر موضوعی سے ہے، اس علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں :

أكثر لطائف القرآن مودعة في الترتيبات والروابط. (البرهان في علوم القرآن : ۱/۳۶)۔

سورۂ بقرہ کی تفسیر کے آخر میں فرماتے ہیں :

ومن تأمل لطائف نظم هذه السورة وفي بدائع ترتيبها علم أن القرآن معجز بحسب فصاحة ألفاظه وشرف معانيه ، فهو أيضا معجز بحسب ترتيبه ونظم آياته ، ولعل الذين قالوا : إنه معجز بحسب أسلوبه أرادوا ذلك ، إلا أني رأيت جمهور المفسرين معرضين عن هذه اللطائف غير منتهجين لهذه الأمور ، وليس الأمر في هذا الباب إلا كما قيل :

والنجم تستصغر الأبصار رؤيته والذنب للطرف لا للنجم في الصغر (التفسير الكبير : ۷/۱۳۹)

علامہ بقاعیؒ فرماتے ہیں :

وبهذا العلم يرسخ الإيمان في القلب ويتمكن من اللب ، وذلك أنه يكشف أن للاعجاز طريقين : أحدهما : نظم كل جملة على حيالها بحسب التركيب ، والثاني : نظمها مع أختها بالنقل إلى الترتيب ، والأول أقرب تناولا وأسهل ذوقا ، فإن كل من سمع القرآن من ذكي وغبي يهتز لمعانيه ، وتحصل له عند سماعه روعة بنشاط ورهبة مع انبساط لا تحصل عند سماع غيره ، وكلما دقق النظر في المعنى عظم عنده موقع الاعجاز ، ثم إذا عبر الفطن من ذلك إلى تأمل ربط كل جملة بما تلته وما تلاها خفي عليه وجه ذلك ، ورأى أن الجمل متباعدة الأغراض متنائية المقاصد ، فظن أنها متنافرة ، فحصل له من القبض والكرب أضعاف ما كان حصل له بالسماع من الهز والبسط ، ربما شككه ذلك وزلزل إيمانه وزحزح إيقانه ..... فإذا استعان بالله وأدام الطرق لباب الفرج بإنعام التأمل وإظهار العجز والوقوف بأنه في الذروة من أحكام الربط كما كان في الأوج من حسن المعنى ..... فانفتح له ذلك الباب ولاحت له من ورائه بوارق أنوار تلك الأسرار ، رقص الفكر منه طربل وشكر الله استغرابا وعجبا ، وشاط لعظمة ذلك جنانه ، فرسخ من غير مرية ، ايمانه. (نظم الدرر : ۱/ ۱۱)

دکتور مصطفیٰ مسلم تفسیر موضوعی کے لئے نظم قرآنی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

علم المناسبات وثيق الصلة بالتفسير الموضوعي وبخاصة التفسير الموضوعي للسورة. (مباحث في التفسير الموضوعي : ۵۷)۔

تفسیر موضوعی کی اهمیت:

قرآن مجید حیات انسانی کے لئے صحیفۂ ہدایت ہے، جو زندگی کے ہر موڑ پر کامل ومکمل رہنمائی کرتا ہے، قیامت تک اب کوئی دوسری آسمانی کتاب نازل نہیں ہوگی، ہر دور میں تمام مسائل وانسانی مشکلات کا حل اس کتاب کے نصوص میں موجود ہے، یہ حقیقت ہے کہ حیات انسانی میں جمود نہیں ہے، وہ ہر لمحہ جواں اور ہر دم رواں ہے، ہر روز کا سورج نئے علمی، تمدنی، تہذیبی، معاشرتی، اجتماعی مسائل کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، ان کے حلول یا ان کے بارے میں ہدایت ربانی، وحکم الٰہی کی معرفت قرآن وسنت کے نصوص پر گہری نظر واجتہاد اور موضوعی مطالعہ کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے، مسائل حیات انسانی کے لئے قرآن کریم کی آیات میں غور وتدبر اور نصوص کا موضوعی مطالعہ وتحقیق سب سے اہم ذریعہ ہے، تفسیر موضوعی کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے، اسی طرح تفسیر موضوعی کے ذریعہ قرآن مجید کے وجوہ اعجاز کے متعدد پہلوؤں کو مزید اُجاگر کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر ہر فن کے اہل اختصاص قرآن کریم کی آیات کے موضوعی مطالعہ کے ذریعہ اس حقانیت کا عین الیقین حاصل کرسکتے ہیں کہ کتاب الٰہی میں ہر تشنگی کے لئے آب زلال موجود ہے اور قرآن مجید ہر پہلو سے گنجینۂ علم وحکمت ہے۔

تفسیر موضوعی کی اہمیت اس پہلو سے بھی ہے کہ آج مغرب نے اجتماعی، نفسیاتی، تربیتی اور تمدنی علوم ومعارف میں خوب ترقی کی ہے، جدید سے جدید تحقیقات ان مضامین پر وجود میں آرہی ہیں، جدید علوم ومعارف کے میدانوں میں ان مضامین کا موضوعی مطالعہ قرآن وسنت کے نصوص کی روشنی میں انتہائی اہم ہے، قرآن کریم سے متعلق مثلاً ان موضوعات ''أصول التربية القرآنية'' یا ''أصول الاعلام الاسلامی'' اور ''علم الحضارة القرآنية'' کا مطالعہ موجودہ علمی میدانوں میں جدید ومبتکر اُسلوب کے ساتھ ایک اہم قدم ہوگا، اسی طرح مقدمہ ابن خلدون کی طرح

علمی سنجیدہ علوم ومعارف کی تحقیق نصوص کی روشنی میں اگر کی جائے تو ہرمنزل پر ہدایت قرآنی کی مشعل فروزاں نظر آئے گی۔

مدارس اسلامیہ اور تفسیر موضوعی:

مدارس اسلامیہ ہندیہ میں تفسیری مواد کی بہت کمی اور ایک قسم کی بےاعتنائی پائی جاتی ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں :

ایک بہت بڑا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں قرآن مجید کے ساتھ بہت کم اعتنائی کی گئی ہے اور تفسیر وملحقات تفسیر کی بہت کم کتابیں رکھی گئی ہیں، کل دو کتابیں تفسیر میں داخل ہیں، بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں اور جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے؛ لیکن اس کے اختصار کا حال یہ ہے الفاظ اور حروف قرآن مجید کے الفاظ وحروف کے برابر ہیں، قرآن مجید کے ساتھ خصوصی اعتناء درکار ہے۔(بحوالہ: ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو:۱۵۵)۔

اگر چہ اس قدیم نصاب کے علاوہ بعض دوسرے نصابات بھی وجود میں آئے جن کے اندر کچھ تغیر وتبدل بھی تھا، ندوۃ العلماء کے نصاب میں متن قرآن کی تفسیر داخل نصاب کی گئی ؛ لیکن آج بھی موجودہ صورتحال ہم سے اس کی متقاضی ہے کہ ہم محاسبہ سے کام لیں، قرآنیات کے بارے مدارس اسلامیہ ہندیہ کا کردار کیا ہے؟ اس کا اندازہ ہم فارغین مدارس کے ''تفسیری ذوق'' اور اس بارے میں ہوئی پیش رفت سے لگا سکتے ہیں۔

میں اس ''تلخ نوائی'' میں معافی کا خواستگار ہوں کہ ہمارے مدارس سے فارغ ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد وہ ہوتی ہے جن کے اندر فکر اسلامی کے بنیادی سرچشمے قرآن وسنت سے استفادہ و استنباط کی صلاحیت تو درکنار--- بالخصوص قرآن کریم سے--- عام آیات کے محض ترجمے کی استطاعت بھی نہیں ہوتی، مدارس کے فضلاء میں عربی ادب کا ذوق، فقہ وافتاء کی صلاحیت کسی درجہ میں پیدا ہوجاتی ہے، حدیث کا تخصص اور اس کا ذوق بھی ہے؛ لیکن علم تفسیر وقرآنیات کا اعتناء دال میں نمک کے برابر بھی نہیں، ہمارے دارالعلوموں میں ''دالافتاء'' و''دارالحدیث'' کا جتنا اہتمام ہے کیا گیا ہے وہی اہتمام کہیں ''دار القرآن'' کا بھی ہے؟ بہر حال قرآنیات کی حالت مدارس اسلامیہ میں بہت ناگفتہ بہ ہے، اس کی وجہ صرف دوٹوک الفاظ میں یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو ایک ایسی کتاب کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں جو صرف ''ابن کثیر وزمخشری رازی وبیضاوی'' کے ہی فہم کی چیز تھی، اس کا تدبر صرف ''اسلاف'' کے لئے مقدر تھا، اس کی ترجمانی وتفسیر میں صرف ان کے اقوال کو یاد رکھنا کافی ہے، زندگی کی ترقی اور روز افزوں نئے نئے فکری، تمدنی، اجتماعی، تعلیمی، تربیتی مسائل کا حل اس میں نہیں ہے، یا کم از کم ہمارے ادراک وشعور فہم وذوق سے بالا ہے، یہ وہ صورت حال ہے جس نے جس قرآن کریم سے بےاعتنائی کے ساتھ نا اُمیدی و قنوطیت کو بھی پیدا کیا ہے اور قرآن کریم کے راست فہم وتدبر پر جمود و تعطل کے دبیز پردے ڈال دئے ہیں۔

قرآنیات اور علم تفسیر پر اگر چہ نمایاں خدمات میں ''فراہی'' و'' اصلاحی'' مکتب فکر کا بڑا حصہ ہے، مگر'' وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ'' وہاں بھی ایک نسل کے بعد صرف ''ذوقِ نظر'' باقی رہ گیا ہے، ہمارے مدارس سے علوم القرآن یا علم تفسیر یا بالفاظ دیگر وہ حضرات کیوں پیدا نہیں ہورہے ہیں، جن کے اندر کچھ ''ولی اللہی'' تب وتاب جاودانہ، فکر ونظر کی بلندی، قرآن وسنت پر گہری نظر ہو، قرآنی ذوق، فہم نصوص کی صلاحیت ہو، ہر مسئلہ کا حل صرف کتاب و سنت ہو؛ بلکہ ان بنیادی مصادر سے راست استفادہ و استنباط کی صلاحیت اور تدبر آیاتِ آفاق وانفس کا ذوق ہو، یقیناً قرآنیات کے اعتناء اور مباحث ومضامین قرآن کے موضوعی مطالعہ سے اس جمود کا کچھ مداوا ہوسکتا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

☆☆☆

❑ فقہی مباحث (قسط—۳)

اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ پرتاپ گڑھ

ہندو مذہب کی کتابوں اور ان کی مذہبی شخصیتوں کی شرعی حیثیت:

اس سوال کا جواب عرض کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی کتاب تعلیم الإ سلام حصہ چہارم سے جس کو میں اپنی محسن کتابوں میں سے ایک مفید بلکہ مفید تر کتاب سمجھتا ہوں جو کہ سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ہر گھر میں یہ کتاب ہونی چاہیے، اور بچے کی نظر اور مطالعے سے گزرنی چاہیے، دو سوالات کے جواب جو عین اس موضوع سے متعلق ہیں، پیش کردوں تا کہ جواب میں آسانی ہو اور اس بہانے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ آجائے اور ان کے حق میں اس عاجز سے اور اس شخص کی زبان سے دعائے خیر نکل جائے جس کی نظر سے یہ مقالہ گزرے کیوں کہ وہ امت کے اکابرین اور محسنوں میں تھے۔

سوال: قرآن مجید میں ہے، وإن من امة إلا خلا فيها نذير (فاطر) یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو اور دوسری جگہ فرمایا ہے ولكل قوم هاد (رعد) یعنی ہر قوم کے لئے ہدایت کرنے والا (بھیجا گیا) ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے کوئی پیغمبر بھیجا گیا ہے، تو کیا ہندوستان میں بھی کوئی پیغمبر آئے تھے؟

ج: ہاں ان آیتوں سے بے شک یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر قوم کے لئے خدا نے کوئی ہادی اور ڈرانے والا بھیجا ہے اور اس لئے ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی آئے ہوں!

سوال: کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوؤں کے پیشوا جیسے کرشن جی اور رام چندر جی وغیرہ خدا کے پیغمبر تھے؟

ج: نہیں کہہ سکتے؛ کیوں کہ پیغمبری ایک خاص عہدہ تھا جو خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ اور خاص بندوں کو عطا فرمایا جاتا تھا، تو جب تک شریعت سے یہ بات معلوم نہ ہو کہ یہ خاص عہدہ خدا تعالیٰ نے فلاں شخص کو عطا فرمایا تھا اس وقت تک ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ خدا کا نبی تھا۔ اگر ہم نے بلا دلیل شرعی صرف اپنی رائے سے کسی شخص کو پیغمبر سمجھ لیا اور فی الواقع وہ پیغمبر نہیں تھا تو خدا تعالیٰ کے حضور میں ہم سے اس غلط عقیدے کا مواخذہ ہوگا۔

یوں سمجھو کہ اگر تم صرف اپنے خیال سے کسی شخص کو سمجھ لو کہ وہ بادشاہ کا نائب یعنی گورنر جنرل ہے اور فی الواقع گورنر جنرل نہ ہو تو تم حکومت کے نزدیک مجرم ہوگے کہ ایک شخص کو جسے بادشاہ نے گورنر جنرل نہیں بنایا ہے تم نے گورنر جنرل مان کر بادشاہ کی طرف ایک غلط بات کی نسبت کی۔

پس گذشتہ لوگوں میں سے ہم خاص طور پر انھی بزرگوں کو پیغمبر کہہ سکتے ہیں، جن کا پیغمبر ہونا شریعت سے ثابت ہو اور قرآن مجید یا حدیث شریف میں ان کو پیغمبر بنایا گیا ہو!

ہندوؤں یا اور قوموں کے پیشواؤں کے متعلق ہم زیادہ سے زیادہ اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ اگر ان کے عقائد اور اعمال درست ہوں، اور ان کی تعلیم آسمانی تعلیم کے خلاف نہ ہو اور انہوں نے خلقِ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کا کام بھی کیا ہو تو ممکن ہے کہ وہ نبی ہوں، مگر یہ کہنا کہ وہ یقیناً نبی تھے بے دلیل بات اور اٹکل کا تیر ہے۔ (تعلیم الاسلام جلد چہارم صفحہ ۱۲-۱۳)۔

کیا ہر قوم اور ہر ملک میں نبی آنا ضروری ہے؟

"ولکل قوم ھاد"

آیت کریمہ کے اس حصہ کی تفسیر و توضیح کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تفسیر ماجدی (جلد دوم صفحہ ٦٦٦ مطبوعہ مجلس تحقیقات لکھنؤ) میں لکھتے ہیں:

''لفظ ہادی عام ووسیع ہے پیغمبر کا مرادف نہیں، اس کے تحت میں نبی اور نائبان سب ہی آجاتے ہیں، ان آیت سے جن لوگوں نے ہندوستان میں کسی نبی کا آنا لازمی قرار دیا ہے، ان کا استدلال قوی نہیں، البتہ درجہ احتمال میں اس کا مان لینا ضروری ہے، اور اسی لیے مفسر تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں زیادہ بحث مباحثہ غیر ضروری ہے''، (تفسیر ماجدی جلد دوم صفحہ ٦٦٦، تفسیر سورۂ رعد)۔

مفتی شفیع صاحب دیوبندی معارف القرآن میں اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ کوئی قوم اور کوئی خطۂ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت دینے اور ہدایت کرنے والوں سے خالی نہیں ہوسکتا، خواہ وہ کوئی نبی ہو یا اس کے قائم مقام نبی کی دعوت پھیلانے والا ہو جیسا کہ سورۂ یٰس میں نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف سے پہلے دو شخصوں کو دعوت وہدایت کے لئے بھیجنے کا ذکر ہے، جو خود نبی نہیں تھے، اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید ونصرت کے لئے بھیجنا مذکور ہے، اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی و رسول پیدا ہوا ہو البتہ دعوت رسول کے پہونچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا ثابت ہے، اور پھر یہاں بے شمار ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا بھی ہر شخص کو معلوم ہے''۔ (معارف لاقرآن جلد ۵، سورہ رعد، صفحہ ۱۷٦)

گوتم بدھ کے بارے میں اسلامی تصور:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں جس سے اس سوال کے جواب کو سمجھنا بالکل آسان ہوجاتا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

''گوتم بدھ کی تعلیمات میں توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے، اور اللہ کی وحدانیت اور عملِ صالح کی طرف بار دعوت دی گئی ہے، نیز پیغمبر اسلام ﷺ کی تشریف آوری کی بابت پیشن گوئی بھی آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے، اس لئے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ بدھ جی ممکن ہے کہ اپنے زمانے میں اللہ کے پیغمبر رہے ہوں۔ ایسا سوچنا یقیناً بعید از قیاس نہیں، لیکن چونکہ قرآن وحدیث میں صراحت سے کہیں آپ کے پیغمبر ہونے کا ذکر نہیں، اس لئے صحیح نقطہ نظر یہی ہے کہ نہ ہم آپ کو نبی قرار دے سکتے ہیں، اور نہ آپ کے ماننے والوں کو اہل کتاب، اور آپ کی شان میں بدگوئی بھی جائز نہیں، کیوں آپ کے نبی ہونے کا امکان تو ہے ہی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے

پیغمبروں کو بھیجا ہے، تو کسی قوم میں گوتم بدھ کا بہ حیثیت نبی آنا کوئی ناممکن نہیں، جب کہ ان کی تعلیمات میں ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو آسمانی کتابوں میں آتی ہیں، پس حاصل یہ ہے کہ نہ گوتم بدھ کی نبوت کی تصدیق کی جاسکتی ہے اور نہ آپ کی ہتک شان کرنا جائز ہے۔ (بحوالہ کتاب الفتاویٰ جلد ۱/۳۶۲)

خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوؤں کی وہ مذہبی کتابیں (ویدرامائن وغیرہ) جن کو (وہ اپنے گمان کے مطابق خدائی تعلیمات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں)، ان کو آسمانی کتاب سمجھنا اور یہ تصور کرنا کہ تورات اور انجیل کی طرح ان کے ماننے والوں نے آمیزش کردی ہے؟ سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، اور یہ غیر اسلامی سوچ اور نظریہ ہے۔ اگرچہ ہندو مذہب کی کتابوں میں خاص کر ویدوں میں توحید کی واضح تعلیمات موجود ہوں، آخرت کا تصور، آنحضرتؐ کی آمد کی خوش خبری اور آپؐ کے اسمائے مبارکہ احمد اور محمد کا اس میں ذکر ہی کیوں نہ ہو۔

لہذا ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو الہامی کتاب تسلیم کرنا اور وہ لوگ جن شخصیتوں کو خدا کا اوتار مانتے ہیں ان کو اپنے عہد کا پیغمبر اور رسول خیال کرنا اور یہ کہ ان کے ماننے والوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح ان کے معاملے میں مبالغہ سے کام لیا ہوگا، اور ان کی کتابوں کو قرآن مجید کے بیشتر عقائد اور اخلاقی تعلیمات میں موافقت کی بناء پر الہامی کتاب تسلیم کرنا کسی طرح درست نہیں ہوگا۔ بلکہ اس موضوع کو حد سے زیادہ کریدنا اور اس کے لئے بے سروپا تاویل کرنا باعث گناہ ہوگا، جیسا کہ بیان القرآن میں مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال کہ اگر ہندوؤں کو صابئین یعنی نوحؑ کی قوم قرار دے دیا جائے اور ان کی مذہبی کتابوں خصوصا وید کو الہامی کتاب تسلیم کرلیا جائے تو اس طرح ہندوؤں کو ان کی اصل یاد دلا کر اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دے کر اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنا آسان ہوگا محض خام خیالی ہے اور اس میں بہت کچھ محل نظر بھی ہے، اور یہ سوچ اور فکر ان حضرات کی خوش فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ یہود و نصاری کو قرآن وسنت نے صاف طور پر اہل کتاب کہا اور ان کی کتابوں کا نام لے کر تصدیق کی اور انھیں ان کی اصل یاد دلائی، مگر اس کے باوجود وہ قریب نہ ہوئے، خاص طور پر یہودیوں میں اور دوری آگئی اس لئے یہ دلیل دینا کہ اس طرح برادران وطن کو ان کی اصل یاد دلا کر اسلام کی دعوت دینا آسان ہے، مناسب نہیں، اس کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوگا البتہ نقصان کا امکان ہے۔

ہنود کو اھل کتاب قرار دینے کی بے جا کوشش:

بعض اہل علم نے محض اس خیال کی بنیاد پر کہ اگر ہندوستان کے ہندوؤں کو "لکل قوم ھاد" کو دلیل بنا کر اہل کتاب، قرار دے جائے اور ان کے ویدوں کو جس میں توحید و رسالت کی بھی تعلیم ہے الہامی کتاب قرار دے دیا جائے تو اس طرح ان کو ان کا ماضی یاد دلا کر اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دینا اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنا بہت کچھ آسان ہوگا، آج کے بہت مسلمان مقرر اور خطیب بھی اپنی تقریروں میں اس طرح کی بے جا تاویلات اور کھینچ تان کرتے ہیں، اور اپنے کو اچار یہ قرار دیتے ہیں، ''رام جی'' کو ابراہیمؑ اور ''مہامنو'' کو نوحؑ قرار دیتے ہیں، نیز ایودھیا کو جودی پہاڑ کہتے ہیں اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہاں لنگر انداز ہوئی تھی، یہ تمام تحقیقات محل نظر ہیں، بلکہ ان مصنفین اور مقررین کی خوش فہمی معلوم ہوتی ہے۔

مولانا شمس نوید عثمانیؒ کی کتاب اگر اب بھی نہ جاگے تو..... جب منظر عام پر آئی تو عوام وخواص میں یہ کتاب کافی مقبول

ہوئی لیکن جب اصحابِ علم وتحقیق کی نظروں سے یہ کتاب گزری تو اس میں بہت سی ایسی خامیاں نکلیں کہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ ان پر تدارک ومحاکمہ نہیں کیا گیا تو مستقبل میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوجائیں گی، اور بہت سے مسلمات کا انکار لازم آئے گا اور کتنے مسلم عقیدوں پر زد پڑے گی۔

خدا بھلا کرے حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب مدظلہ العالی کا کہ انھوں نے اس کتاب کا ناقدانہ مطالعہ فرمایا اور قابل گرفت چیزوں پر مثبت انداز میں تبصرہ فرمایا اگر چہ کہ عدیم الفرصتی کی بنا پر پوری کتاب پر تبصرہ اور نقد نہیں فرما سکے صرف چند قابل نقد اجزاء پر گفتگو کی گئی ہے، مگر مولانا کے اس مختصر نقد سے اس کتاب کی حیثیت کا اندازہ کر لینا آسان ہوجاتا ہے۔

مولانا مدظلہ العالی کے اس گراں قدر مضمون کا ایک حصہ جو اس موضوع سے بہر حال متعلق ہے پیش خدمت ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''کتاب کا معتد بہ حصہ اس دعویٰ کے اثبات میں ہے کہ ''مہا منو'' ہی حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور ہندو قوم، قومِ نوح ہے، لیکن جو کچھ بھی اس بارے میں پیش کیا گیا ہے وہ تمام غیر مصدق کتابوں سے ماخوذ اور قیاس پر مبنی ہے، اس لئے ان تفصیلات سے اگر وہ سب درست مان لی جائیں تو زیادہ سے زیادہ اس کا امکان واحتمال ثابت ہوتا ہے کہ مہا منو، نوح تھے اور ہندو، قوم نوح ہے (یقین واعتقاد نہیں) حالانکہ متعین طور پر کسی طور پر کسی شخص کو نبی ماننے کے لئے یقینی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ کسی شخص کا متعین طور پر نبی ہونا ''مؤمن بہ'' میں شامل ہے اور ایمانیات کا اثبات دلائل قطعیہ سے ہوتا ہے، مجرد احادیث صحیح سے بھی نہیں ہوتا، (یعنی جو درجۂ تواتر یا شہرت کی نہ ہوں) ظاہر ہے کہ مصنف کے استدلالات کتب غیر مصدقہ پر مبنی قیاسات واحتمالات ہیں جو صحیح اخبار وآحاد کے درجہ کے تو کیا ہوتے اضعاف (بلکہ منکر وموضوع) روایات کے درجہ کے بھی بمشکل قرار دیئے جا سکتے ہیں، پھر ان سے یہ عقیدہ کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے کہ ''مہا منو'' نوح تھے، اگر کتاب کا ناواقف قاری، مصنف کے زور بیان سے مرعوب ہوکر ایسا اعتقاد کر لے تو وہ کلامی وفقہی اعتبار سے ضلال ہی کے زمرہ میں آنے کے لائق ہوگا، کتاب کا یہ پہلو وہ ہے جس پر بہت سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس سے اثرات بڑے خطرناک اور گمراہ کن ہوسکتے ہیں، ایسا ہی کچھ معاملہ ''وید'' کو آسمانی کتاب اور ہندوؤں کو (سابق زمانہ اور اپنی اصل کے لحاظ سے) اہل کتاب ماننے کا ہے، اس سے بھی زیادہ خطرناک نتائج کتاب میں مندرج ان تحقیقات سے نکل سکتے ہیں، جن کی رو سے ایودھیا کا حرم، احمد یا محمد کا رام، حضرت عیسیٰؑ کی ہندوستان آمد، ہندو مذہب سناتن دھرم کا اسلام، مکہ معظّمہ منکیشور، شیولنگ کا حجر اسود ہونا، ثابت کیا گیا ہے، اگر چہ مصنف کا مقصد تو ہندوؤں کو اسلام اور شعائر اسلام نیز نبی اسلام کے عقیدہ سے قریب ثابت کرنا ہے، مگر تصویر کا دوسرا رخ بھی اگر سامنے ہو کہ اس سے ہندوؤں کے اس دعویٰ کو تقویت پہنچے گی کہ ''یہ تمام مقامات کعبہ، مکہ، حجر اسود) اصلا ہندوؤں کے ہیں لہذا انھیں واپس ملنے چاہیں'' (متاع علم وفکر صفحہ ۳۸۰-۳۸۱)

(.....جاری)

☆☆☆

تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

غذائیت اور مشکلات:

عام طور پر انسان اس کو خوش نصیبی سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے کھانا تیار کرے، اور وہ اسے شوق سے کھائیں اور اس کی قدر بھی کریں، اس کو سراہیں۔ اس کے برخلاف انسان کے لیے یہ بات واقعی پریشان کن ہوتی ہے کہ وہ کسی کے لیے کھانا تیار کرے، پھر وہ نہ صرف یہ کہ کھانے سے انکار کرے بلکہ اس طرح کا احساس دلائے کہ گویا اس کے نزدیک اس کی ضیافت اور اس کے اکرام کی کوئی قدر اور حیثیت و قیمت ہی نہیں ہے۔ کھانے کو انسانوں کے درمیان جذبات واحساسات کے تبادلے کا طاقتور ذریعہ بھی شمار کیا جاتا ہے، گویا دعوت قبول کرنے کا مطلب میزبان کو قبول کرنا ہے اور دعوت کا انکار گویا میزبان کا انکار ہے، کھانے کو قبول کرنے اور اس کا انکار کرنے کا تعلق دراصل انسانی تعلقات سے ہے، اس کی بہت سی نفسیاتی اور معاشرتی دلیلیں بھی ہیں۔

اس لیے یہ فطری بات ہے کہ والدین بچوں کو غذا فراہم کرنے کو بچہ کے تئیں اپنی محبت کی علامت سمجھیں، والدین بچوں کو کھانے کے لے جب کچھ دیتے ہیں اور بچے اس کو کھاتے ہیں، تو اس سے والدین خوش ہوتے ہیں، لیکن وہی بچے اگر کھانے سے انکار کردیں تو الدین کو تکلیف ہوتی ہے، فی الحقیقت بچوں کے کھانے یا انکار کرنے سے والدین کی خوشی یا تکلیف کے پیچھے اور بھی عوامل ہوتے ہیں، چونکہ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ بچے کی نمو اچھی ہو، اس کی صحت اچھی رہے، اس کی جسمانی پرداخت میں کوئی فرق نہ آئے، اس کو جس قدر ویٹامن اور پروٹین کی ضرورت ہے وہ ملتی رہیں، ان میں کوئی ایسی کمی نہ رہ جائے جس سے اس کی صحت پر فرق پڑے، ظاہر ہے کہ اگر کھانا بچ جائے اور اسے پھینکنا پڑے تو یہ مادی نقصان کا سبب ہے، اسی طرح اگر والدین بچوں کو لے کر رشتہ داروں یا دوستوں کے یہاں جائیں اور وہاں بچے کھانے سے انکار کریں تو یہ ایک تو معاشرتی مشکل ہوگی، دوسرے بچے کی غذائیت کا مسئلہ ہوگا، ان مشکلات سے زیادہ سخت مرحلہ یہ ہے کہ والدین یہ سوچنے لگیں، کہ اگر انھوں نے بچے کو اس کی اجازت دی کہ وہ اپنی مرغوب غذاؤں کے بارے میں بتادے، تو وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں ان پر دباؤ بنانے لگے گا اور اپنی خواہشات پوری کرنے پر زور دے گا، پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس طرح کا سرکش ہوجائے کہ اس کو راضی کرنا مشکل ہوجائے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بچوں اور والدین کے مابین ابتدائی سالوں میں کھانے کو لے کر کافی کشمکش رہتی ہے، بہت کم ہی بچے ایسے ہوتے ہیں جو اس عمر میں کھانے کو لے کر کسی طرح کی مشکل نہیں پیدا کرتے، بعض بچے تو اس مسئلہ کو بہت زیادہ پیچیدہ کردیتے ہیں، ان کے سامنے جو کچھ رکھا جاتا ہے اس کو کھانے سے انکار کرتے ہیں، بلکہ ماں کے جذبات کی پروا کیے بغیر اٹھا کر زمین پر پھینک دیتے ہیں، انھیں اس سے مطلب نہیں ہوتا کہ جب ماں

اسے زمین پر پڑا ہوا دیکھے گی تو اس پر کیا گذرے گی، بعض بچے کھانے کے دوران لقمہ کھانے کی میز پر یا زمین پر گرا دیتے ہیں، جس سے ساتھ کھانے والے ہر شخص کو پریشانی ہوتی ہے۔

عام طور پر ایسے بچوں کو غذا پہنچانے کی کوشش میں ماں کھانے کی کوئی چیز دیتی ہے، جب بچہ انکار کرتا ہے تو دوسری تیسری چوتھی چیز فراہم کرتی ہے اور اسے ہر طرح کچھ نہ کچھ کھلانے کی کوشش کرتی ہے، چونکہ ماں اس فکر میں پریشان رہتی ہے کہ وہ کم از کم اتنا کھالے جو اس کے جینے کے لئے کافی ہو اور جس سے وہ قلت غذائیت سے پیدا ہونے والے امراض کا شکار نہ ہو اور صحیح طور پر نمو ہو سکے، اس لیے یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہے کہ کھانے میں ان تمام مشکلات کے باوجود فطری اور صحیح نشو ونما کے لیے اس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے وہ کھالیتا ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی جسمانی مرض میں مبتلا ہو جائے، غالب گمان یہ ہے کہ مشکل سے کھانے والا بچہ کمزور ہو جائے، لیکن پھر بھی بچہ کا کھانے میں پریشان کرنا اور بہت مشکل سے کھانا اس کا باعث نہیں بنتا کہ اس میں زندگی اور نشاط وحرکیت اس کے ہم عمر بچوں سے کم ہو۔

کھانے میں مشکلات پیدا کرنے والے بچوں کے ساتھ تعامل میں ہم کو دو نکتے ملحوظ رکھنا چاہیے:

۱۔ بچوں کی بھوک اور ان کی غذائیت کے درمیان نمایاں فرق ہوتا ہے، ہر بچے کے کھانے کی مقدار وضرورت الگ الگ ہوتی ہے، اسی طرح ان کے کھانے کا رویہ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔

۲۔ اس کا بھی احتمال رہتا ہے کہ بچے کے کھانے میں جو بڑی مشکل پیش آرہی ہے وہ بچے کے مزاج پر نہیں بلکہ والدین پر موقوف ہو۔

یہ معاملہ والدین پر منحصر ہے کہ وہ کھانے کے لازمی اوقات (ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا) کو لڑائی جھگڑے اور دنگل بنا دیتے ہیں یا نہیں، اب اگر ایسے موقع پر ماں اپنے بچے کی صحت کو لے کر زیادہ پریشان ہوگی تو نہ کھانے پر وہ بچے کی پٹائی بھی کرے گی، اس کو یہ بھی خوف ستائے گا کہ کہیں یہ مستقبل میں سرکش نہ ہو جائے، ماں کو عاجز کرنے کے نتیجہ میں بچہ کھانے کو فرش پر، بستر پر اور تکیہ پر بھی پھینکے گا، پھر یہ معاملہ اس قدر بڑھے گا کہ کھانے کا وقت جھگڑے اور تنازعات کا وقت بن جائے گا، نتیجہ کچھ اس طرح کا ہوگا کہ ماں بچے کے سامنے کھانے کی پلیٹ رکھے گی، بچہ لقمہ دو لقمہ کھائے گا اور پھر کہے گا کہ وہ کھا چکا، اور ماں کے ساتھ ''کھانے کو کھلونا'' بنا کر کھیلے گا، ماں اس کو تنبیہ کرے گی اور پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے کو صاف کرنے کو کہے گی اور وہ انکار کرے گا، ماں خوشامد کرے گی، اصرار کرے گی اور وہ منع کرے گا، پھر ماں چمچے کے ذریعہ لقمہ اس کے منہ میں داخل کرنے کی کوشش کرے گی، اور وہ پوری طاقت سے منہ بند کرلے گا اور لقمہ منہ کے ادھر ادھر چہرے پر لگ جائے گا، ماں مزید کوشش کرے گی اور بچہ منہ ادھر ادھر پھیرے گا، بسا اوقات لقمہ اس کے کان میں چلا جائے، ماں اس کو طبی، غذائی اور معاشرتی پہلو سے نصیحتیں کرے گی اور وہ بار بار انکار کرتا جائے گا، بالآخر پلیٹ کا کھانا اس طرح ختم ہوگا کہ وہ زمین پر یا دیوار پر پڑا ہوگا۔

اس طرح کی کوششیں ایک آدھ بار ہوں گی، پھر تو کھانے کا وقت باقاعدہ جھگڑے اور تنازعات کے اوقات میں تبدیل ہو جائے گا، دونوں فریق ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کریں گے، ماں اس سے اپنی بات ماننے اور اطاعت کرنے کا مطالبہ کرے گی اور وہ اس کے سامنے چیخے گا روئے گا، اس پر ان سب چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ اس طریقہ کار سے اس کی سرکشی میں اضافہ ہو اور کوئی فائدہ نہ ہوگا، بلکہ بسا اوقات تو وہ اس کھیل سے محظوظ ہوگا اور ہنسے گا، قہقہے لگائے گا، بار بار جب یہ قصہ پیش آئے گا تو ماں پریشان ہوگی، غصہ ہوگی اور بچہ ہنسے گا یا روئے گا، لیکن اس کے رونے کے پیچھے بھی فتح وغلبہ کا جذبہ اور خوشی ہوگی۔

اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود سے سوال کرے کہ آخر یہ

صورت حال کیوں پیش آتی ہے؟ آخر اس پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے اور اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟

بنیادی بات یہ ہے جس کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ بچے کے سامنے چیخنے چلانے اور اس سے اطاعت کا مطالبہ کرنے سے اس سلسلہ میں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، یہ صحیح ہے کہ بچے کی زندگی اور اس کے سلوک پر والدین کا حاکمانہ حق ہے، مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ بچہ ان کے حکم سے لقمہ نگل ہی لے گا، یہ تو مشاہدے کی بات ہے کہ جو بچے اپنے ماں باپ کے فرمانبردار ہوتے ہیں، بلکہ ماں باپ کو راضی کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں ان کو بھی ایسا لقمہ اتارنے میں پریشانی ہوتی ہے، تردد ہوتا ہے جو لقمہ انھیں مرغوب اور پسند نہ ہو۔

اگر بچے کو کھانے اور ناشتہ کے اوقات میں بار بار اس طرح کا پریشان کن تجربہ ہوگا، اور بار بار اس طرح زور زبردستی اور جھگڑے کے واقعات پیش آئیں گے، تو اس کو ان اوقات سے ہی نفرت ہونے لگے گی، اور ماں بھی کھانے کے اوقات قریب آنے پر ذہنی تناؤ کا شکار ہوگی، اور پھر یہ معاملہ یوں ہی تب تک چلے گا جب تک بچے میں شعور نہ پیدا ہو جائے اور وہ سکون کے ساتھ اہل خانہ کے ساتھ کھانے میں شرکت نہ کرنے لگے۔

کھانا کیسا ہے اور کس طرح بنایا گیا ہے، اس کا احساس بچوں میں بڑوں سے زیادہ شدید ہوتا ہے، چنانچہ بڑے جو چیز پسند نہیں کرتے اس کو بغرض ضرورت ہی کھاتے ہیں، ورنہ اس سے گریز کرتے ہیں، لیکن بچے کسی حال میں بھی اپنی ناپسندیدہ چیز کا ایک لقمہ بھی منہ میں رکھنے کو تیار نہیں ہوتے، اس لیے ماں اگر کوئی ایسی چیز کھلانے کی کوشش کرتی ہے جو بچہ نہیں کھانا چاہتا تو یہ کار عبث اور فضول ہی ہے۔

بچپن کے ابتدائی مرحلہ میں غذائیت کا قاعدہ یہ ہے کہ ماں تھوڑی مقدار میں کھانا بنائے، بچے کے سامنے اس کی پلیٹ رکھ دے اور اپنے سامنے اپنی پلیٹ رکھے، خود اپنا کھانا شروع کر دے اور اپنی پلیٹ صاف کر لے، بچہ اس کو اس طرح کھاتا دیکھے گا تو خود بھی کھائے گا، اس کو تنہا کھانے میں جو الجھن اور اکتاہٹ ہوتی ہے وہ بھی نہیں ہوگی، اس طرح اس کو ماں اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے کا بھی حوصلہ ملے گا بجائے اس کے کہ وہ تنہا کھانے بیٹھے اور بار بار اٹھ کر بھاگے اور اپنے کھیل کھلونوں میں مصروف ہو، یہی نہیں بلکہ اس طرح دوسرے امور میں بھی شرکت کا سبق حاصل کرے گا۔

اس کے باوجود اگر بچہ کھانے سے انکار کرے تو ماں کو چاہیے کہ اس کو تذکیر کرے اور کہے کہ ''بیٹا آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا''، پھر اس میں وہ لذت نہیں رہے گی جو گرم کھانے میں رہتی ہے، اگر وہ بار بار انکار ہی کرتا ہے، تو بھی ماں کو صرف اور صرف تذکیر ہی کرنا ہے کہ کھانا کھالے، پھر اگر ماں کو لگے کہ وہ جتنا کھا چکا اس سے زیادہ اب نہیں کھائے گا تو ماں کو چاہیے کہ اس کے سامنے سے پلیٹ اٹھا لے اور بالکل بھی اس سے کچھ نہ کہے، اس طرح بچے کو لگے گا کہ ماں کو کھانے کے وقت اس کے ساتھ کھانے اور بیٹھنے میں لطف آتا ہے، کیوں کہ وہ دیکھے گا کہ بسا اوقات ماں اپنا کھانا ختم کر لیتی ہے پھر بھی اس سے باتیں کرتی ہے اور اسے تذکیر کرتی ہے کہ وہ بھی اپنا کھانا ختم کر لے، وہ یہ بھی محسوس کرے گا کہ وہ کھانا پورا کھائے یا چھوڑ دے ماں اس سے بالکل پریشان نہیں ہوتی ہے، اگر وہ نہ کھائے یا کچھ چھوڑ دے تو یہ عتاب و سرزنش کا سبب نہیں ہوا ہے، اور اس کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ کھانے کے اوقات (ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا) ایسے بہتر و خوشگوار اوقات ہیں جن میں بچہ اپنی ماں اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ مل کر بیٹھتا ہے، وہ اگر کھانا نہ کھائے یا کچھ ناگواری کا اظہار کرے تب بھی اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کی رعایت کی جاتی ہے اور اس سے کھانے کے لیے کوئی زبردستی نہیں کرتا، پھر اگر اس کے دوست اس کو کسی وقت یہ بتائیں گے کہ

ان کی والدہ ان سے کھانے کے لئے زبردستی کرتی ہیں اور ان کو کھانے پر مجبور کرتی ہیں تو اس کے دل میں اپنی ماں کی قدر بڑھ جائے گی کیوں کہ وہ سوچے گا کہ میری ماں تو میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتی ہیں۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، مسئلہ یہ ہے کہ اگر بچہ نے دوپہر میں ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تو غالب گمان یہی ہے کہ وہ اب شام کے کھانے کے وقت تک بھوکا رہے گا، اس لیے یہ موقع اس کو سمجھانے اور یہ بتانے کے لئے مناسب ہے کہ کھانے کے وقت کھانا کیوں ضروری ہے، لیکن اس کو سمجھاتے ہوئے لہجہ ملامتی اور تحکمانہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ بہت نرمی کے ساتھ سمجھانا چاہیے کہ جب کھانے کے موقع پر ہم ٹھیک سے نہیں کھائیں گے تو دوسرے وقت کے کھانے تک ہم بھوکے رہیں گے، ایسے موقع پر ماں کو اپنے اوپر کنٹرول کرنا چاہیے کہ وہ آنے والے وقت طعام تک درمیان میں اس کی بھوک کچھ کم کرنے کے لئے اس کو بسکٹ، کیک اور چاکلیٹ وغیرہ نہ دے، اگر دوپہر میں اس نے نہیں کھایا ہے تو شام کے کھانے تک آپ دیکھیں گے کہ وہ کیسے چیخے گا، روئے گا اور بسکٹ و چاکلیٹ وغیرہ کا مطالبہ کرے گا، بچہ عموماً جب ایسا کرتا ہے تو گھر والے اس کی چیخ پکار سے بچنے اور اس کو مطمئن کرنے کی خاطر اس کے کچھ نہ کچھ مطالبات پورے ہی کر دیتے ہیں، عام طور پر جو مٹھائیاں یا دیگر چیزیں بچے کو دی جاتی ہیں ان میں غذائیت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کی کھانے کی خواہش کو مار دیتی ہیں، اگر بالکل بچپن سے ہی بچے کو ٹافی، چاکلیٹ اور کینڈیز وغیرہ کا عادی بنا دیا گیا تو پھر اس کی یہ مشکل بڑھتی جائے گی اور اسکے نتائج برے ہوں گے، اور اگر ٹافی وغیرہ دینا ہی ضروری ہو تو پھر ماں کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی وقت متعین کرے، مثلاً ناشتے کے بعد سے ظہر کے درمیان یا ظہر سے عصر کے درمیان کسی وقت دے دے، مگر مقدار بہت کم ہو، عام حالت میں تو ماں کو ٹافی چاکلیٹ وغیرہ بچے کی پہنچ سے دور ہی رکھنا چاہیے، اس طرح بھی مناسب ہے کہ جب ماں چائے وغیرہ پیے تو بچے کو ایک ٹافی یا چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا دے دے، اس طرح بچے کو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اگر وہ ایک وقت ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتا تو دوسرے وقت کے کھانے تک وہ بھوکا رہے گا، اور اس کے بھوکے رہنے کے سبب اس کو پیٹ بھرنے کے واسطے مٹھائیاں، کینڈیز یا چاکلیٹ نہیں دی جائیں گی، یہی زندگی کی فطری اور حقیقی شکل ہے، ممکن ہے کہ بچہ جس طرح زندگی کی دوسری حقیقتوں کے متعلق سوالات کرتا ہے، جیسے ''بارش کیوں ہوتی ہے؟'' ویسے یہ بھی سوال کرے کہ وہ زیادہ مقدار میں ٹافی چاکلیٹ کیوں نہیں کھا سکتا؟ تو ماں کو صرف سمجھانے پر اکتفا کرنا چاہیے کہ ٹافیوں کی کثرت اس کے دانتوں کے لیے نقصاندہ ہے، اس سے فیٹ (Fat) بڑھتا ہے اور بھوک کی خواہش کم ہوتی ہے۔

البتہ اگر ماں کو لگے کہ بچہ بہت بھوکا ہے، یا بھوک سے اس کی بلڈ شوگر کم ہو رہی ہے، تو اس کو کچھ پھل، کھجور یا میوے دے دے، یا روٹی کا ایک ٹکڑا دے دے تاکہ اس میں زندگی کی رمق لوٹ آئے، اس کو جسمانی نشاط حاصل ہو جائے، اور اگر بھوک سے اس کی حالت اور زیادہ خراب ہو تو ماں کھانے کے متعین وقت کو کچھ مقدم کر سکتی ہے، اور پھر اس سے کہہ سکتی ہے کہ اب آپ اپنی رغبت اور بھوک کے مطابق کھانا کھا لیجئے، یاد رکھیے کہ کھانے سے ہی پیٹ بھرا جا سکتا ہے، ٹافی اور چاکلیٹ وغیرہ سے پیٹ بھرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس طرح ماں کی استقامت سے بچے کو یہ سبق ملے گا کہ کھانے کے اوقات متعین ہوتے ہیں، اس کا ایک متعین نظام ہوتا ہے، ان اوقات میں اس کو اختیار ہے کہ کھائے یا نہ کھائے، چنانچہ وہ اگر متعین وقت پر کھانا چھوڑ دیتا ہے تو اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ آنے والے کھانے کے وقت تک بھوکا رہے، تھوڑی ہی مدت میں اس طرح وہ زندگی کے نظام کو سمجھ لے گا اور پھر نظام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے گا۔

اس نظام کا عادی بنانے کے ساتھ ساتھ ماں کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بعض بچے دن میں کئی بار کھاتے ہیں اور تھوڑا تھوڑا کھاتے ہیں، چنانچہ اگر گھر میں ناشتہ جلدی کرنے اور دوپہر کا کھانا دیر میں کھانے کا رواج ہو تو بچے کو ان دونوں کے درمیان کچھ نہ کچھ دینا چاہیے تاکہ وہ کئی گھنٹے بھوکا نہ رہے، یہ الگ بات ہے کہ پھر اس کو دوپہر میں ہلکا کھانا دیں۔

یہ عام بات ہے کہ اگر کسی وقت کا کھانا بچہ چھوڑ دے تو پھر دوسرے وقت وہ زیادہ کھائے گا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بچہ آئندہ بھی اسی طرح زیادہ مقدار میں کھائے گا، وہ تو ظاہر ہے کہ اپنی ضرورت کے بقدر ہی غذا لے گا، کھانے کے اوقات میں پیدا ہونے والی پریشانیوں کا بہترین علاج یہ ہے کہ بچہ کو کھانے میں اختیار دے دیا جائے، ضمناً یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بچہ وہی غذا لے گا جو اس کا جسم قبول کرے گا، اس لیے ماں کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ بچہ کو کون سی غذاؤں کی ضرورت ہے، جس وقت وہ بھوکا نہ ہو اس وقت اسے اس کی ضرورت کے مطابق ہر طرح کی غذا فراہم کرنا ضروری نہیں ہے، مگر جب وہ بھوکا ہو یعنی جب بھوک کا وقت ہو تو اسے صرف ایک روٹی دے دی جائے تو یہ صحیح نہیں ہے، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ماں ہر وقت بچہ کے لیے کھانا پکائے، عام طور پر بچے پکے ہوئے کھانے ہی کو کھانے سے انکار کرتے ہیں، عام طور پر وہ کچی سبزیوں جیسے گاجر وغیرہ اور خشک غذائیں کھانے کو ترجیح دیتے ہیں، اگر وہ اس طریقہ سے اپنی غذا حاصل کرلیں، اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے ماں کے لیے یہ آسانی بھی ہوتی جاتی ہے کہ وہ کھانے کے اوقات سے پہلے بچے سے معلوم کرلے کہ وہ کیا کھانا چاہتا ہے، ماں اس کے لیے کیا تیار کرے، لیکن بہتر یہ ہے کہ ماں اس کو مطلق اختیار نہ دے بلکہ چند چیزوں کے نام بتا کر اختیار دے کہ ان میں سے وہ انتخاب کرے، کیوں کہ غذائیت ان سبھی چیزوں میں ہوگی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب اس پر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے چونکہ اس کو بنوایا ہے اس لیے اس کو ضرور کھائے، کیوں کہ اگر ایسا کیا گیا تو اس سے بچے کے اندر آزادی واختیار پر اعتماد میں کمی آئے گی، وہ اختیار واجبار میں کچھ غیر ضروری ربط سمجھ بیٹھے گا، اس کو محسوس ہوگا کہ اختیار وانتخاب اس کا تھا اس لیے اب اس کے نتیجہ میں وہ مجبور ہے کہ زبردستی اس کھانے کو پیٹ میں اتارے، اس لیے جس وقت ماں اس سے اس کا انتخاب پوچھے اس وقت غور کرلے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابھی تو یہ کہہ رہا ہے بعد میں کھانے کے وقت وہ اس چیز کو ناپسند کرے اور پھر اس کے لیے اس کا ہی انتخاب (choice) بے لذت وغیر مرغوب ثابت ہو، اس کے علاوہ ماں کو یہ بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ بچے نے غذا کو منتخب کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر کھانا شروع کرتے وقت بچے کو تھوڑا سا دینا چاہیے، نہ کہ زیادہ مقدار میں دیا جائے اور پھر اس کو کھانا چھوڑنے کی عادت پڑ جائے یا اس کو پلیٹ صاف کرنے کے لیے مجبور کیا جائے، البتہ اگر اس کو کم دیا جائے گا تو اس کو ختم لینے کے بعد بقدر ضرورت وہ خود ہی دوبارہ مانگ لے گا۔

اکثر والدین پوچھتے ہیں کہ بچے کے ساتھ ترغیب کا اسلوب اپنانا یا اس کو کچھ لالچ دینا کیسا ہے؟ مثلاً اس سے کہا جائے کہ: ''پورا کھانا کھالو پھر چاکلیٹ دیں گے'' یا ''کھانا پورا ختم کرلو پھر تو مٹھائی دیں گے'' وغیرہ۔

درحقیقت اس طرح کا لالچ دینا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ عملاً یہ ترکیب بعض خاص حالات کے علاوہ کامیاب نہیں ہوتی، اس ترکیب کے باوجود بچہ کھانا تو نہیں کھائے گا البتہ یہ ضرور سیکھ لے گا کہ والدین سے اس کو جو کچھ لینا ہو بغیر شرط اور بھاؤ تاؤ کے ملنا مشکل ہے، اس کو یہ احساس ہوگا کہ صرف اس کی خوشی کے لیے والدین اس کو کچھ نہیں دیں گے بلکہ کچھ نہ کچھ شرط پوری کرنا ضروری ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترغیب کے سبب کبھی کبھار مطلوب عمل ہوجائے گا،لیکن بچہ بہت جلدی اس اسلوب کا عادی بن جائے گا اور پھر وہ بار بار ہر کام کی قیمت وصول کرے گا، بالخصوص کھانے کے سلسلہ میں تو یہ موقف قطعی درست نہیں، کیوں کہ پھر کھانے کے وقت بجائے کھانے کے پر توجہ دینے کے وہ مٹھائی اور ٹافی پر توجہ دے گا، بلکہ وہ اسی ثانوی چیز کے لیے کھانے کے اوقات کا انتظار کرے گا، کہ کھانے کا وقت آئے اور وہ ٹال مٹول کرکے اپنی مرغوب چیز حاصل کرے۔

اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اگر کھانے کے بعد مٹھائی اور پھل وغیرہ کھانا ہی ہے،تو بچہ کھانا ختم کرے یا نہ کرے بہرصورت اس کو دے دینا چاہیے، لیکن یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ زیادہ مٹھائیاں نہ استعمال کی جائیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مٹھائیوں کی جگہ تازے پھل استعمال کیے جائیں۔

بچے کو اگر کوئی سبزی یا پھل وغیرہ پسند نہیں تو بار بار اس کو دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے،اس کو اگر کھانے پر مجبور کیا جائے تو بھی کوئی حاصل نہیں،مثلاً بچہ اگر گاجر نہیں کھاتا ہے تو کوئی حرج نہیں،ایسا بھی تو نہیں ہے کہ اگر وہ گاجر نہ کھائے تو اس کے ہیموگلوبن میں اس کی صحت اوروں سے خراب ہوگی، بچے کو اگر کوئی چیز ناپسند ہے تو یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ کیوں ناپسند ہے، اس کی ناپسندیدگی کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں،کبھی کوئی چیز رنگ کی وجہ سے،خوشبو کی وجہ سے، ظاہری شکل یا ذائقہ کی وجہ سے پسند نہیں ہوتی، ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وقت کے ساتھ بچے اس مرحلہ کو پیچھے چھوڑ کر گذر جاتے ہیں،بشرطیکہ ان کے ساتھ سختی اور زبردستی نہ کی جائے، یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اگر بچہ کوئی ایک چیز ناپسند کر رہا ہے تو دوسری چیزیں ایسی ضرور ہوں گی جن کو پسند کرتا ہوگا،اس لیے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے والدین پریشان ہوں۔

صبح دوپہر اور شام کو اجتماعی طور پر کھانے کے اوقات اس اعتبار سے بہترین موقع فراہم کرتے ہیں کہ سب اہل خانہ مل کر بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے کی خیر خیریت سے واقف ہوتے ہیں،مختلف امور پر گفتگو کرتے ہیں،منصوبوں کا تذکرہ ہوتا ہے،آپسی تعلقات میں قربت وتقویت پیدا ہوتی ہے،لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر والدین ان مواقع کو گنوا دیتے ہیں،یا کم از کم وہ چھوٹے بچوں کو اس کا موقع نہیں دیتے ہیں، کیوں کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بچے کو پہلے کھانا کھلا دیا جاتا ہے، تاکہ بعد میں خود کو اطمینان سے کھانا کھانے کا موقع مل جائے، اس طرح ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے اور گفتگو کرنے کا موقع فوت ہوجاتا ہے، پھر جب یہی عادت پڑ جاتی ہے اور اسی حال میں بچہ بڑا ہوجاتا ہے تو مشکل سے ہی وہ دیگر افراد خاندان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتا ہے،جس کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ سب کے اوقات میں فرق ہوتا ہے،سب کے کام مختلف ہوتے ہیں،اور سب کی توجہات وترجیحات علیحدہ ہوتی ہیں،لیکن اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچہ اجتماعی شعور اور خاندانی مراسم کو نبھانے کے سلیقہ اور بڑوں سے ملنے کے طریقہ کو سیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے،اس کے برعکس جو بچے اپنے والدین کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں، ان کو دیکھا گیا ہے کہ دوسروں کے بالمقابل زبان کے استعمال پر زیادہ قادر ہوتے ہیں،ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بھی اچھا ہوتا ہے، وہ اظہار رائے اور آپسی گفتگو کا سلیقہ بھی سیکھتے ہیں، یہ سب فائدہ ان کو بڑوں کی گفتگو سن کر ہوتا ہے، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان کو دوسرے بچوں کی بہ نسبت عام معلومات بھی زیادہ ہوتی ہیں اور وہ اپنے والدین کی زندگی کے متعلق بھی خوب معلومات رکھتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میاں بیوی کبھی بچوں کے بغیر تنہا کھانا نہ کھائیں، درحقیقت مقصد اصلی یہ ہے کہ کھانے کے متعین اوقات میں تمام افراد خانہ شریک ہوں، ہاں اگر کسی کو کوئی کام ہے، عام طور پر والد کو ہی ہوتا ہے،مثلاً وہ رات کو دیر سے آتے ہیں،تو کم از کم پوری فیملی کو صبح کا ناشتہ ایک ساتھ کرنا چاہیے، اسی طرح ہفتہ

واری چھٹی کے دن سب کو ایک ساتھ کھانا چاہیے، اہل خانہ کو چاہیے کہ وہ دسترخوان پر بچوں کو پوری طرح گفتگو میں شریک کریں، انھیں اپنی رائے دینے کا پورا موقع دیں، اس طرح جب گفتگو کریں تو کوشش کریں کہ بچے سنیں، اپنی گفتگو ایسی آسان زبان میں کریں جس کو بچے سمجھ سکیں، پھر اگر بچے کسی چیز کے متعلق سوال کریں تو ان کے لیے وضاحت کریں، بچوں کو خاموش رہنے کی تلقین کرنے سے گریز کریں، ان سے بار بار یہ نہ کہا جائے کہ جب تک ابا بات پوری نہ کرلیں وہ خاموش رہیں، اس کا نقصان یہ ہوگا کہ بچہ پھر بولنا اور بات کرنا بند کردے گا، یہ سب آداب فرصت کے اوقات میں سکھانا چاہیے، آپسی گفتگو کے دوران بچے کو بھی سوال و جواب کرنے دیں، بلکہ بچے کے سامنے اس کا اظہار کریں کہ بچہ جب ان کی گفتگو میں شرکت کرتا ہے تو والدین کو بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے، والدین تو اس کی رائے جاننے اور اس کی بات سننے کے مشتاق رہتے ہیں، اگر کبھی اس کو منع کرنا ضروری ہو کہ جب تک متکلم اپنی بات پوری نہ کر لے تب تک وہ خاموش رہے اور بیچ بیچ نہ بولے تو اس کو بہت پیار اور شفقت سے منع کیا جائے، عملاً بچہ کو اپنے سلوک سے یہ احساس دلایا جائے کہ جب بچے آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو ہم ان کی بات نہیں کاٹتے اور نہ ہی انھیں ڈسٹرب کرتے ہیں، بچوں کی پرورش و تربیت میں جس طرح ہر موقع پر گرم جوشی اور توجہ و اہتمام مفید ہے اسی طرح دسترخوان پر بھی مفید ہے، بلکہ یہاں اس کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے۔

مذکورہ بالا مثبت نتائج و فوائد کے علاوہ اس طرح کی شرکت و گفتگو کے کچھ اور لازمی فائدے ہوتے ہیں، جو درحقیقت بہت دور رس اور دیرپا ہوتے ہیں، مثلاً بڑوں کے ساتھ گفتگو میں شرکت کر کے بچہ کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ بھی ایک اہم فیملی ممبر ہے، اس کے پاس بھی کچھ ہے جس کو وہ بیان کرسکتا ہے، جس کا اظہار کرتا ہے تو گھر کے لوگ اس کو توجہ سے سنتے ہیں، اس پر توجہ دی جاتی ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ اپنے عاجز کردینے والے سلوک کے ذریعہ والدین کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا، پھر وہ کھانے کے اوقات سے لطف اندوز ہوتا ہے، اس کے ٹھیک سے کھانا کھانے کا احتمال بھی بڑھ جاتا ہے، اس کی امید کم ہوجاتی ہے کہ وہ ان غافل لوگوں کی طرح ہوگا جن کو دسترخوان پر آنے کے لیے دس مرتبہ پکارنا پڑتا ہے، یا وہ ان لوگوں کی طرح ہوگا جو دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے کو غیر مطمئن محسوس کرتے ہیں، اکتاتے رہتے ہیں، اور موقع ملتے ہی اٹھ کر بھاگتے ہیں، اس لیے قاعدہ یہ ہے کہ بچے کو بچپن میں مختلف امور میں شریک کیا جائے جس سے وہ بڑا ہو کر دوسروں کے ساتھ شریک ہونا سیکھے گا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بچے کی عمر کے ابتدائی مراحل میں والدین کو آداب طعام کا پاس ولحاظ نہ کرنے سے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ اہم یہ ہے کہ پہلے وہ اس طرح کے کاموں سے لطف اندوز ہونا سیکھے، اور آسانی سے کھانا کھانے لگے، پھر اس کے بعد اس کے لیے بہت وقت ہے کہ اس کو آئندہ کھانے کے طور طریقے سکھائے جائیں اور ضروری عادات و اخلاق سے آگاہ کیا جائے، ابتدائی مرحلہ میں تو بس کھانا کھانا اور اچھی صحبت ہی اہم ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کھانے کے اوقات میں دسترخوان اکھاڑ پچھاڑ اور میدان جنگ میں نہ تبدیل ہو، اگر اس سے مکمل اجتناب ہوجائے تو پھر کھانے کے اوقات سے والدین اور بچے دونوں ہی محظوظ ہوتے ہیں، اور پھر ان کے پاس ایسی ہموار اور پرسکون فضا ہوتی ہے جس میں دیگر امور انجام دیے جاسکتے ہیں، آئندہ بڑھتی عمر اور ذمہ داریوں اور مصروفیات کے اضافہ کے بعد اجتماعی اور خانگی زندگی میں یہی کھانے کے اوقات وہ بنیادی اوقات ہوں گے جہاں سب افراد خانہ اکٹھا ہوسکیں گے، اور ساتھ مل کر بیٹھ سکیں گے، اور ہر عام و خاص مسئلہ پر باہمی گفتگو کرسکیں گے۔

☆☆☆

□ انکار حدیث

ابوریّہ اوراس کی کتاب کے بارے میں چند باتیں

محمد فرید حبیب ندوی

ابوریّہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، جب میں نے اس پر غور کیا تو مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے:

(۱) وہ عبارتیں نقل کرنے میں گڑ بڑی کرتا ہے، بسا اوقات کہیں اکا دکا لفظ بڑھا دیتا ہے یا گھٹا دیتا ہے، جس سے پورا مفہوم بدل جاتا ہے، اور کبھی ایسا کرتا ہے کہ کسی قول کو اس کے قائل کے علاوہ کسی اور شخص کی جانب منسوب کر دیتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ابوریہ نے اپنی کتاب میں حضرت عبداللہ بن عمرو کے بارے میں لکھا ہے:

''ان کے پاس اہل کتاب کی مذہبی کتابوں کے دو تھیلے تھے، جنھیں وہ آنحضور کی جانب منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے''۔

ابوریہ نے یہ قول حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری ۱/۱۶۶ کے حوالے سے نقل کیا ہے، حالانکہ اس میں ''آنحضورﷺ کی طرف منسوب کرنے'' کے الفاظ کہیں نہیں ہیں، ابوریہ نے یہ الفاظ از خود بڑھا دیے اور قاری کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔

۲۔ ابوریہ نے البدایہ والنہایہ ۸/۲۰۶ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ: ''حضرت عمرؓ نے کعب احبار سے کہا تھا: ''حدیث رسول کو روایت کرنا چھوڑ دو، ورنہ میں تمہیں جلاوطن کردوں گا''۔

حالانکہ البدایہ میں ''الحدیث عن الأول ''(اقوام گذشتہ کے واقعات) کے الفاظ ہیں۔ ''عن رسول الله '' کے الفاظ نہیں ہیں، مگر اس نے تحریف کر دی۔

۳۔ اسی طرح اس نے البدایہ والنہایہ ۸/۱۰۶ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ڈانٹا تھا کہ تم حدیث روایت کرنا چھوڑ دو، ورنہ میں تمہیں جلاوطن کردوں گا۔

یہاں بھی ابوریہ نے افترا پردازی سے کام لیا ہے، اس نے یہاں حضرت ابو ہریرہؓ کا نام زبردستی اپنی طرف سے ٹھونس دیا، حالانکہ حضرت عمرؓ نے کعب احبار کو ڈانٹا تھا نہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو، ابن کثیر نے یہی نقل کیا ہے۔

۴۔ ابوریہ نے اپنی کتاب میں مختلف مقامات پر لکھا ہے کہ حضرت عمر و عثمان و علی اور عائشہ وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ کی تکذیب کی تھی، اس نے یہ اقوال ابن قتیبہ کی ''تاویل مختلف الحدیث'' کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔

حالانکہ ابن قتیبہ نے یہ کتاب لکھی ہی ان لوگوں کے رد میں

ہے جنھوں نے صحابہ کرام یا بعد کے راویان حدیث پر تنقید کی ہے، انھوں نے نظّام اور معتزلہ کے وہ اقوال جو ان لوگوں نے صحابہ کی شان میں کہے ہیں، ذکر کر کے ان کا رد کیا ہے، ابوریہ نے یہ خیانت کی کہ مثلاً ابن قتیبہ نے جو قول نظّام کے حوالہ سے ذکر کیا، اس نے اسے خود ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دیا۔

(۲) وہ اپنے نظریے کی تائید میں علماء کے ایسے اقوال سے استدلال کرتا ہے جن کا اس موضوع و مقام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، مثلاً اس نے کہا کہ حضرت ابو ہریرہؓ تدلیس کرتے تھے، پھر اس نے تدلیس کی مذمت میں علماء کے اقوال ذکر کیے، حالانکہ جسے اس نے تدلیس کہا ہے، علماء اسے ارسال کہتے ہیں۔

اسی طرح اس نے ابو ہریرہؓ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا، پھر رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے کی مذمت میں حدیثیں پیش کیں، ظاہر ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ مدلس تھے ہی نہیں اور انھوں نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں، تو یہ اقوال ان پر کیسے چسپاں ہو سکتے ہیں!!

(۳) وہ عبارتوں کا مفہوم غلط سمجھتا ہے، جیسے اس نے حضرت ابو ہریرہؓ کے قول ''علی ملء بطنی'' کا مفہوم غلط سمجھا، اور جیسے اس نے بسر بن سعد کے اس قول کو غلط سمجھا، جس میں کعب احبار کی مرویات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے درمیان خلط ملط کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

(۴) وہ اپنے مطلب کے خلاف ایسی صحیح احادیث کو جھٹلا دیتا ہے، جن کی صحت پر علماء کا اجماع ہے اور ان مرویات کو سند کا درجہ دے دیتا ہے جو علماء کے یہاں بالاتفاق مردود ہوتی ہیں، چنانچہ وہ بخاری و مسلم و سنن اربعہ وغیرہ کی ان روایات کو جھٹلا دیتا ہے جن میں ذکر ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے حفظ کی شکایت کی، تو آپ نے انھیں دعا دی، اور اس کے برعکس کتاب الحیوان، شرح ابن ابی الحدید اور عیون الاخبار وغیرہ کے مندرجات کو نہایت معتمد سمجھتا ہے۔

(۵) ابو ریہ ڈاکٹر اسپرنگر اور گولڈزیہر جیسے مستشرقین کا پیرو ہے؛ بلکہ وہ حضرت ابو ہریرہؓ پر تنقید کرنے میں ڈاکٹر اسپرنگر سے بھی دو ہاتھ آگے ہے، اسپرنگر نے تو لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ وضع حدیث سے کنارہ کش رہتے تھے اور کہا ہے کہ بہت سی احادیث بعد میں ان کی جانب غلط طور سے منسوب کر دی گئیں، مگر ابوریّہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ حضور ﷺ پر جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے تھے، اگر اس سے حلال کی تحریم اور حرام کی تحلیل نہ ہوتی ہو۔

(۶) وہ نہایت گھٹیا اور سوقیانہ الفاظ و کلمات استعمال کرتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہو تو وہ الفاظ دیکھئے جو اس نے حضرت معاویہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ اور ان لوگوں کے بارے میں لکھے ہیں جو اس کی نادر تحقیقات سے متفق نہیں ہیں۔

(۷) ابو ریہ اپنے تئیں بڑا ذہین باور کراتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ تمام صحابہ بشمول حضرت عمرؓ بڑے سادہ لوح تھے، جو ان نو مسلم اہل کتاب کے دام فریب میں آ گئے جو اسی لیے مسلمان ہوئے تھے کہ دین میں باطل کی آمیزش کر دیں۔ دور صحابہ و تابعین کے بعد کے ہزاروں علماء بھی اس کے نزدیک سادہ لوح اور غفلت شعار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسی نادر تحقیقات اور بے نظیر کتاب اس نے پیش کی، ایسی کوئی نہ کر سکا۔

(۸) ابو ریہ نے دعوی کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو

ناقابل تردید براہین ودلائل سے مزین کیا ہے، اس کے دعوی کی سچائی کے لیے اس کے ان مصادر پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا ہی کافی ہوگا:

(۱)حیوٰۃ الحیوان :دمیری (۲)العمدہ : ابن رشیق (۳)المعارف :ابن قتیبہ (۴)نہایت الأرب:نویری (۵)البیان والتبیین :جاحظ (۶)الحیوان :جاحظ (۷)عیون الاخبار :ابن قتیبہ (۸)رحلۃ ابن جبیر (۹)الخطط: مقریزی (۱۰)الفخری: ابن طباطبا (۱۱)معجم الأدباء :یاقوت الحموی (۱۲)تاریخ بغداد :خطیب بغدادی (۱۳) تاریخ :ابن عساکر (۱۴) تاریخ :ابو الفداء (۱۵)النجوم الزاہرہ (۱۶)معجم الحیوان :معلوف پاشا (۱۷)ابو ہریرہ:عبدالحسین (۱۸)خزانۃ الادب:بغدادی (۱۹)خاص الخاص:ثعالبی (۲۰)ثمار القلوب :ثعالبی (۲۱)الصداقۃ والصدیق:توحیدی (۲۲)نکت الہمیان :صفدی (۲۳)شرح لامیۃ العجم :العلوانی (۲۴)تاریخ التمدن الاسلامی: جرجی زیدان (۲۵)العرب قبل الاسلام :جرجی زیدان (۲۶)دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (۲۷)الحضارۃ الاسلامیۃ : کریمر (۲۸)السیادۃ العربیۃ :فولتین (۲۹)حضارۃ الاسلام :ابراہیم پازجی (۳۰)تاریخ العرب:فلپ ہٹی (۳۱)تاریخ الشعوب الاسلامیۃ : بروکلمان (۳۲)المسیحیۃ فی الاسلام :لوقا (۳۳) العقیدہ والشریعۃ فی الاسلام :گولڈ زیہر۔

یہ ہیں اس کے مصادر ومراجع ، اس نے صحاح ستہ کی روایات کوتو جھٹلا دیا، مگر اسکافی اور ثعالبی اور ابن ابی الحدید کی حکایات واخبار اس کے نزدیک سند اور معتمد ہیں۔

۹۔ ابوریہ نے علمی تحقیق کا دعوی کیا ہے، مگر ہمیں بھی تو کوئی بتائے کہ آخر وہ علمی تحقیق ہے کیا ؟ حدیثوں کی تصحیح و تضعیف کے یہ اصول کون سے ہیں؟ کیا صرف اس کی بنیاد عقل پر ہے اور پھر عقل کس کی معیار ہے کیا ابوریہ کی عقل معیار ہے؟ پھر ہم ابو ہریرہؓ کی روایات کا کیا کریں؟ وہ سب ضعیف ہیں یا کچھ صحیح اور کچھ ضعیف؟ ان میں تمیز کیسے ہوگی؟ اس نے ایک اپنے سوا سب علماء ومحدثین کو غافل قرار دیا ہے، کیا یہی علمی منہج ہے؟ ایسا علمی منہج بس ابوریہ کو ہی مبارک ہو۔

اس تفصیل سے نتیجہ نکلا کہ دو اسباب کی وجہ سے ابوریہ کی کتاب کی کوئی علمی حیثیت نہیں رہ جاتی:

۱۔ اس کی کتاب علمی منہج سے خالی ہے۔

۲۔ مصنف علمی امانت سے محروم وتہی دست ہے۔

والله يقول الحق وهويهدى السبيل۔

☆☆☆

کامیابی کا راز

قاسم علی شاہ (پاکستان کے مشہور کاؤنسلر) کا بڑا معنی خیز جملہ ہے:

''عادتیں ہم بناتے ہیں۔ پھر عادتیں ہمیں اور ہمارے مستقبل کو بناتی ہیں، دنیا کا کوئی بندہ اپنے مستقبل کو تو نہیں بدل سکتا، البتہ اپنی عادتوں کو بدل سکتا ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ اپنی عادتیں بدل لے۔ اس کی عادتیں اس کا مستقبل بدل دیں گی''۔

❑ تجزیہ

جدید ہندوستان، فرقہ پرستی، اور ملی قیادت

نجم الہدیٰ ثانی

معروف دانشور، کالم نویس اور تاریخ داں رام چندر گھا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہر سوچنے سمجھنے والے ہندوستانی کے ذہن میں گاندھی اور مارکس ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں اسی طرح یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ ہر سوچنے سمجھنے والے ہندوستانی کی سوچ اور گفتگو میں فرقہ پرستی، کرکٹ اور سیاست کے لئے ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ نکڑ کی چائے دوکان سے لے کر ٹی وی چینلز کے دمکتے اسٹوڈیوز تک اور ڈرائنگ روم سے لے کر پارلیمان کے ایوانوں تک رہ رہ کر ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مگر اس ہمہ گیر 'مقبولیت' کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بحیثیت ایک سیاسی وحدت ہم ان تینوں کے منفی اثرات کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ مثلاً، فرقہ پرستی اب فسطائیت کے اس مرحلے پر ہے جہاں وہ ایک منتخب جمہوری حکومت کی سرپرستی میں بنیادی آئینی حقوق پر کھلے بندوں حملے کر کے ہندوستانی جمہوریہ کی فلسفیانہ بنیادوں کو کمزور کر رہی ہے۔ گزشتہ چند مہینوں میں پیش آنے والے واقعات اسی حقیقت کا عملی اظہار ہیں۔ اسی طرح کرکٹ اپنے تمام تر نوآبادیاتی لواحق وسوابق کے ساتھ ملک کا مقبول ترین کھیل ہے۔ حالیہ برسوں میں عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ سرمایہ اور گلیمر کے عناصر کی شمولیت نے اسے دیگر کھیلوں کے لئے برگد کے اس درخت کی مانند بنا دیا ہے جس کے سائے میں کسی اور پودے کی نشو ونما ممکن نہیں ہوتی ہے۔ اور جہاں تک سیاست کا سوال ہے تو اس کی اقداری گراوٹ کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیاست داں ہونا اور کرپٹ ہونا اب ایک ہی حقیقت کے دو پہلو بن چکے ہیں۔

گرچہ ملی قیادت کے لئے یہ بات ہمیشہ اہمیت کی حامل تھی کہ وہ ملک میں موجود دائیں بازو کی سرگرمیوں کے متعلق ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی کرے تاکہ سماج میں نفرت وعداوت کی جو فضا بنانے یا قائم رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی اس کا سدباب ہو سکے۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور ملی قیادت اس قسم کا کوئی اقدامی لائحہ عمل نہیں بنا سکی جس کا نتیجہ اب یہ نکل کر سامنے آیا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کا جو کام کبھی سنگھ پریوار کے رضا کار کرتے تھے اب اعلی سرکاری مناصب پر فائز افسران، دانشوران، میڈیا ہاؤسز، اور گلی محلوں میں موجود عام لوگ کر رہے ہیں۔ مگر کف افسوس ملنے سے بہتر ہے کہ ملی قیادت کھلے ذہن کے ساتھ اس نازک مسئلہ کی جانب متوجہ ہو اور اس ناسور کے خاتمہ کیلئے ایک منصوبہ بند طویل المیعاد زمینی جدوجہد کا آغاز کرے۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں جدید ہندوستان کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان وسیع تر عوامل ومحرکات کی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے ملک میں فرقہ پرستی کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں ملی قیادت کے اہم سنگ ہائے میل کا جائزہ اس اعتبار سے لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی تاریخ کے خدوخال، اور مزاج ورجحان کس حد تک واضح ہو کر سامنے

آجائیں تاکہ مستقبل کے لئے لائحہ سازی کا عمل دفتری خانہ پری کے بجائے ایک طویل اجتماعی جدوجہد کا نقش اولیں ثابت ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے مرکزی الفاظ – جدید ہندوستان، فرقہ پرستی اور ملی قیادت – کا مفہوم مختصراً واضح کر دیا جائے تاکہ آنے والے مباحث کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

'جدید ہندوستان' سے مراد 1857 کے بعد سے اب تک کا زمانہ ہے۔

فرقہ پرستی سے مراد 'حقائق کے متعلق افراط وتفریط پر مبنی وہ ذہنی وعملی رویہ ہے جس کا حامل فرد یا سماج زندگی کے مسائل اور امکانات کو کسی مخصوص سماجی اکائی یا گروہ کے مخصوص مفادات کی عینک سے دیکھتا ہے اور دیگر افراد وسماجی اکائیوں کے متعلق نفرت، شک، اور خوف کے جذبات رکھتا ہے، اور اس کا بدترین اظہار فرقہ وارانہ تشدد اور فسادات کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس رویے کی تشکیل میں بے شمار چھوٹے بڑے عوامل اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں مگر مذہب کا حصہ بوجوہ زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے'۔

ملی قیادت سے میری مراد 'وہ تنظیمیں اور جماعتیں ہیں جن کی سرگرمیوں کا محور ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے مسائل کا حل ہے'۔

اس اعتراف کے ساتھ کہ فرقہ پرستی اور ملی قیادت کی مذکورہ بالا تعریف یا وضاحت کئی وجہوں سے ناقص ہے ہم اب نفس مسئلہ کی طرف آتے ہیں کیوں کہ اس مضمون کا مقصد فی نفسہ ان الفاظ کی جامع اور مانع تعریف متعین کرنا نہیں ہے۔

جدید ہندوستان، انتخابی جمہوریت، اور فرقہ پرستی: عام طور پر ہندوستانی تاریخ میں جدید دور کا نقطۂ آغاز 1857 کی جنگ آزادی کو مانا جاتا ہے۔ گویا عہد وسطیٰ کی مغلیہ سلطنت اور تاج برطانیہ کے جدید ہندوستان کے مابین 1857 ایک حد فاصل ہے۔ اس کے بعد کی ایک صدی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اسی دور میں ہندوستانی قوم کے اس سیاسی اور فکری ماہیے کی تشکیل ہوتی ہے جس کا منطقی نتیجہ آئین ہند کی ترتیب اور نفاذ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی، اور فکری معرکوں نے جدید ہندوستان اور ہندوستانی سیاسی قومیت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہمارے موضوع کے اعتبار سے یہ بات دلچسپ ہے کہ عہد وسطیٰ سے عہد جدید تک کے سفر میں ہندوستانی سماج میں فرقہ پرستی کے تعلق سے فکری اور عملی دونوں سطح پر ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ مغلیہ عہد میں شاہی طرز حکومت کی وجہ سے فرقہ پرستی کو ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ ایسا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ ملوکیت میں حکمرانوں کو اپنے اقتدار کے لئے کسی مخصوص مذہبی یا سماجی اکائی کی حمایت کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ، جمہوریت کے برعکس، ہر کوئی ان کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے۔ نیز اس طرز حکومت میں بغاوت اور لاقانونیت کسی صورت برداشت نہیں کی جاتی تھی اور شر پسند عناصر کی سرکوبی فی الفور کی جاتی تھی۔ اس دور میں فرقہ پرستی یا اس پر مبنی تشدد کے نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تب فرقہ وارانہ تشدد صرف دو مذاہب کے ماننے والوں کے رمیان تصادم سے زیادہ اس علاقے میں ریاست یا بادشاہ کے مخالفین کے لئے اشارہ ہوتا کہ ابھی بغاوت کے لئے حالات سازگار ہیں۔ ان وجوہات سے فرقہ پرستی کی سیاسی سرپرستی عہد وسطیٰ میں ممکن تھی اور نہ مطلوب۔

انگریزوں کے دور میں بھی استبدادی طرز حکومت کی وجہ سے یہی صورتحال برقرار رہنی چاہیے تھی مگر اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی خاطر انگریزوں نے جب بھی مناسب خیال کیا علمی اور انتظامی دونوں سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شک وشبہ اور نفرت کو ہوا دینے کی کوشش کی۔ اسی لئے عہد وسطی کے برخلاف جدید ہندوستان میں معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے فرقہ وارانہ تشدد معمول بن گیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شک وشبہ اور عداوت کی وہ خلیج پیدا ہوگئی جو آج تک پاٹی نہیں جا سکی ہے۔

اسی دور میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں ایک ایسا طبقہ بھی ابھر کر سامنے آیا جس نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو غلامی کا دور قرار دیا اور مسلمانوں کے متعلق شد و مد سے اس بات کی تشہیر کرنے لگا کہ یہ ہندوستان کے اصل باشندے نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت بیرونی حملہ آوروں کی ہے۔انہوں نے عہد وسطیٰ کی تہذیبی و انتظامی ترقیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایسے تہذیبی اور علمی عہد زریں کا خیال پیش کیا جو بیرونی مسلمان حملہ آوروں کی وجہ سے آگے اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکا۔تاریخ کے ان واقعات کو جس میں،اس تشریح وتعبیر کے مطابق ،مسلمانوں نے ہندوؤں پر ظلم کیا تھا خوب مرچ مسالہ لگا کر مسلسل بیان کیا جانے لگا۔اس کے بالمقابل عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی وہ سماجی تاریخ جس میں مختلف مذاہب کے لوگ بقائے باہم کے اصول پر زندگی گزارتے تھے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔

جد و جہد آزادی کی آخری تین دہائیوں میں گاندھی جی کی شخصیت ایک کرشمائی اور ہرفن مولا رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہوکر سامنے آئی۔انہوں نے نہ صرف آزادی کی لڑائی کو فیصلہ کن مرحلہ تک پہونچایا بلکہ ایک سماجی مصلح اور اخلاقی فلسفی کی حیثیت سے معاشرہ اور اس کے مسائل کے متعلق بھی کھل کر اور تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔انہوں نے اپنی تحریر وتقریر اور سیاسی سرگرمیوں میں ہندو عقائد اور دیومالا کا بار بار ذکر کیا۔اسی لئے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور منصوبہ بندی کے اعتراف کے با وجود کچھ مؤرخین اور مبصرین کی جانب سے ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے عوام تک اپنا پیغام پہونچانے کے لئے جن ہندو تاریخی و اساطیری علائم وآثار اور شخصیات کا سہارا لیا اس نے 'ہندو' مذہبی شعور کو بیدار کر کے دائیں بازو کے لئے زمین ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

برطانوی استعماریت کے خلاف آزادی کی یہ جد وجہد جس طریقہ سے اپنے اختتام کو پہونچی اس نے بھی ملک میں فرقہ پرستی کو گویا 'ریزرویشن' دلا دیا۔ اسی لئے آزادی کی جدوجہد کے دوران جب آنے والی جدید ہندوستانی قوم کی تشکیل ہو رہی تھی ایسے واقعات کثرت سے ہونے لگے جس میں مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے حریف اور مدمقابل بن کر سامنے آئے۔خاص طور پر سیاست کے میدان میں آزادی سے پہلے کے آخری پانچ دس برس جذباتی نعروں، اشتعال انگیز تقریروں، مذہبی علیحدگی پسندی اور موہوم امیدوں اور اندیشوں کا دور تھا۔عوام اس مسئلے کے سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں اور پیچیدگیوں کا کتنا ادراک رکھتے تھے یہ ایک الگ بحث ہے مگر جو بات ان کے ذہنوں میں بالآخر راسخ ہوکر عوامی حافظہ کا حصہ بن گئی وہ یہ تھی کہ مسلمان اس ملک کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔اس ایک واقعہ نے ہندو-مسلم تعلقات کے پورے ڈھانچہ کو نا تلافی نقصان پہنچایا۔اس طرح فرقہ پرستی کا وہ جن جسے آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں انگریزوں نے بوتل سے باہر نکالا تھا آج تک باہر ہی ہے اور بوتل میں واپس جانے کے لئے کسی صورت تیار نہیں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید ہندوستان میں جب اس سیاسی قومیت کا ارتقاء ہو رہا تھا جو عہد وسطیٰ کے سیاسی نظام کے برعکس ایک نئے سیاسی شعور کی علامت تھی تو دوسری جانب فرقہ پرستی بھی اس دائرہ میں اپنے پاؤں پسار رہی تھی جو بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے اسے میسر آرہا تھا۔

اب ہم جدید ہندوستان کے اس دور کی طرف آتے ہیں جس کی ابتداء 1947 سے ہوتی ہے اور جس میں ایک نئے آئین کے تحت ملک کو سیکولر، سوشلسٹ ڈیموکریٹک ریپبلک قرار دے کر اس کی ہمہ جہت تعمیر کا عمل شروع ہوا۔ ایشیاء اور افریقہ کے بہت سارے ممالک کے برعکس ہندوستان میں جمہوریت کا تجربہ کامیاب رہا اور آج ہمارا ملک دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت بن کر ابھرا ہے۔ دیگر ممالک میں فوجی آمریت اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے جمہوری

قدریں سماج میں اپنا قدم جمانے میں ناکام رہیں۔اس لحاظ سے ہندوستان میں جمہوریت کا تجربہ اوراس کے نتیجہ میں وجود میں آنے والا سیاسی نظام اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ایک مختلف اور حوصلہ افزا منظر نامہ پیش کرتا ہے: انتخابات کا تسلسل، پر امن انتقال اقتدار، عدلیہ کی آزادی، حق رائے دہی کا استعمال، اظہار خیال کی آزادی، جمہوری حقوق کی یقین دہانی، وغیرہ ایسے بنیادی جمہوری اقدار وتصورات ہیں جو گزشتہ تقریباً سات دہائیوں میں ہندوستانی سماج کے سیاسی تجربہ کا حصہ بن گئے ہیں۔

اس خوش آئند حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مسلم ہے کہ بحیثیت مجموعی ہندوستانی سیاسی طبقہ یا پالیٹیکل کلاس خود آئین کی روح کے ساتھ کھلواڑ کرتی رہی ہے۔مثلاً انتخابات کے عمل کو، جو جمہوریت کی فصل کے لئے کھاد پانی کے مترادف ہے،ان کی سیاسی ابن الوقتی نے حقیقی معنوں میں ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ملک کی ترقی کے لئے پالیسی اور پروگرام،عوام کے مسائل کو حل کرنے کے لئے نئے اور اچھوتے حل،تعلیمی اصلاحات کے ذریعے نئی نسلوں میں سائنسی طرز فکر کی ترویج، وغیرہ کیلئے سنجیدگی سے پالیسی سازی اور قانون سازی کے بجائے سیاست دانوں نے ذات پات، مذہب، علاقائیت، وغیرہ کے آزمودہ نسخے کو اپنا کر اقتدار تک پہنچنا اپنا مطمح نظر قرار دیدیا۔اس سیاسی طرز فکر نے آئین سازوں کے اس خواب کو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا کہ یہ ملک عالمی منظر نامہ پر جدید سیاسی اصولوں پر قائم ایک روشن خیال جمہوری فلاحی ریاست کی شکل میں ابھرے۔انتخابات کی روح کو مجروح کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ قدیم سماجی ناہمواری، مذہبی نارواداری اور جاگیردارانہ فکر، دام ہمرنگ زمین کی صورت جمہوریت کے قالب میں اپنا کھیل کھیلنے لگیں۔

مگر پانی سر سے اونچا اس وقت ہوا جب ہندوستانی سماج کا وہ حصہ جو آزادی سے قبل مسلم دشمنی اور فسطائیت کا نظری علمبردار بن کر اٹھا تھا اب ایک محسوس سیاسی قوت بن کر انتخابی سیاست کے راستے اقتدار کے مراکز پر قابض ہونے لگا۔انتخابی سیاست کے اس بحرانی دور میں کرسی کے پجاریوں نے مذہب کی بنیاد پر ہندوستانی عوام کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا شروع کیا اور کلاسیکی فسطائی طریقہء کار پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سماج کے دیگر طبقات میں شک وشبہ اور نفرت وحقارت کی فضا پیدا کرنی شروع کی۔انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین متنازعہ مسائل کو ابھار کر اس طرح پیش کیا کہ ایک جانب وہ دونوں قوموں کی 'ناک' کا مسئلہ بن گئے اور دوسری طرف ان گنت خانوں میں تقسیم ہندو سماج کو متحد کرنا بھی ان کے لئے آسان ہوگیا۔لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ فرقہ پرستی کی اس یورش میں صرف دائیں بازو کی اعلی ذات (جنہیں اکثر لوگ غلطی سے صرف ہندو کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں) کے سیاسی نظریہ ساز اور منصوبہ ساز شامل تھے بلکہ نام نہاد سیکولر سیاست دانوں نے بھی اس معرکہ میں خوب خوب داد شجاعت دی اور آئین کی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں اپنا کردار بہت خلوص کے ساتھ ادا کیا۔ اب نوبت ایں جا رسید کہ فرقہ وارانہ فساد یا کشیدگی انتخابی منصوبہ بندی کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔اس کار خیر میں بھی ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرست اور سیکولر کہا جانے والا ہر دو خیمہ شامل ہے۔

یہاں مزید تین عوامل کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس نے شہروں سے دور دیہات اور قصبات کی رواداراور پر امن فضاؤں کو بھی فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم کر دیا ہے۔یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بڑے شہروں کے آرام دہ کمروں میں بیٹھے نفرت کے آڑھتیوں کو پھیرے لگانے والے انہیں گاؤں اور چھوٹے شہروں سے ملتے ہیں۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات بالعموم شہروں میں ہوتے ہیں۔دیہی علاقے اس درندہ کا فطری مسکن نہیں ہے۔مگر اب یہ ان علاقوں میں بھی آنکلتا ہے۔اس سلسلے میں اقتدار کے عدم ارتکاز کے نظریئے کے تحت ہونے والے پنچائتوں اور کونسلوں کے

انتخابات کا ہندو-مسلم تعلقات پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ان مواقع پر یہ پرامن جزیرے بھی نفرت کے تھپیڑوں کی زد میں آجاتے ہیں۔ انتخابات تو دیر سویر گزر جاتے ہیں مگر اپنے پیچھے سماجی تعلقات میں ڈھیر ساری تلخیاں چھوڑ جاتے ہیں جو بارود کا کام کرتی ہیں اور کوئی معمولی واقعہ یا حادثہ ان کے لئے چنگاری کا کام دیتا ہے۔

اسی طرح فرقہ پرستی کے نفوذ اور فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر الیکٹرانک اور سوشل میڈیا، بالخصوص علاقائی میڈیا، کے رول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان ذرائع سے اگر ایک جانب معلومات اور انٹرٹینمنٹ پروسا جاتا ہے تو دوسری جانب 'اندرونی ہندوستان' یعنی دور افتادہ گاؤں اور قصبوں تک وہ آوازیں بھی پہونچ جاتی ہیں جو نفرت کی پرستار اور فرقہ پرستی کی علمبردار ہیں۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہاں میڈیا کی نیت پر حملہ نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس بات کا تجزیہ مقصود ہے کہ اسے کس طرح فرقہ پرستی کے لئے استعمال کیا جارہا ہے یا وہ خبر رسانی کا فرض ادا کرتے کرتے کس طرح غیر شعوری طور پر فرقہ پرستوں کے کام آجاتا ہے۔

فرقہ پرستی کے فروغ میں غربت بھی ایک اہم عامل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غربت اور فرقہ پرستی لازم وملزوم ہیں اور سماج کے غریب طبقات فطرتاً تشدد پسند اور فرقہ پرست ہوتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کو جب بھی امن عامہ میں خلل ڈالنا ہوتا ہے وہ وہ لالچ دیکر اور دھونس جما کر غریبوں کا استعمال کرتے ہیں۔ غربت اور بے بسی کے چکرویوہ میں صدیوں سے پھنسے یہ مجبور لوگ جب تشدد پر آمادہ ہوتے ہیں تو یہ کسی نظریہ اور پالیسی کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ان کے سامنے دو وقت کی روٹی اور اپنے معصوم بچوں کا بھوک سے مرجھایا چہرہ ہوتا ہے۔

جدید ہندوستان میں جمہوریت کی بظاہر چہل پہل کے باوجود فرقہ پرستی کی 'مقبولیت' کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔ دیگر کئی ایشیائی اور افریقی ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی جمہوریت ایک طرز زندگی، رویے اور اگر ایک لفظ میں کہا جائے تو ایک بنیادی اخلاقی قدر کی حیثیت سے عوام کی انفرادی اور سماجی زندگی میں راسخ نہیں ہوسکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کو صرف ایک طرز حکومت سمجھا گیا ہے جس کا تعلق خاندان، تعلیم، ادب، تربیت، ادارہ سازی، دفتر، باہمی تعلقات، مجلسی گفتگو، وغیرہ سے نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے نئی نسل سے یہ توقع رکھنا کہ گھر کی چار دیواری میں اپنی ماں اور بہنوں کے حقوق کی پامالی دیکھنے کے بعد جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھے تو جمہوری اقدار اور اخلاقیات کی علمبردار ہو، سادہ لوحی ہوگی۔ اس لحاظ سے ہندوستانی سماج میں مذہب اور جمہوریت کی حالت بہت حد تک یکساں ہے۔ یہاں مذہبی رسوم وتقریبات انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ منائی جاتی ہیں مگر مذہبی اقدار وروحانیت، جو ان کا مقصود ہے، عنقا ہے۔ اسی طرح انتخابات کو 'جشن جمہوریت' سمجھ کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا ہے مگر جمہوری قدروں کی پاسداری کی بات دیوانے کی بڑ سمجھی جاتی ہے۔

مسلم قیادت اور فرقہ پرستی کا چیلنج:

گزشتہ صفحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جدید ہندوستان میں فرقہ پرستی اور سماجی وسیاسی جدیدیت پہلو بہ پہلو اپنا دائرہ اثر بڑھاتی رہیں۔ اس کا آغاز، جیسا کہ پہلے گزرا، آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں ہی، جو جدید ہندوستانی سیاسی قوم کا تشکیلی دور تھا، ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو ایک عجیب وغریب صورتحال کا سامنا کرنا پڑا: ایک جانب انہیں ملک کی تقسیم کا ذمہ دار مانا جارہا تھا اور انہیں اس 'جرم' کا بار بار احساس بھی دلایا جاتا تھا تو دوسری جانب وہ ایک 'سوشلسٹ جمہوری ری پبلک' کے آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے دیگر سماجی اکائیوں کی طرح ان تمام حقوق وفرائض کے مکلّف وسزاوار تھے جن کی ضمانت اس ملک کا آئین اپنے شہریوں کو دیتا ہے۔ ان ہمت شکن حالات کی سنگینی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ بات بھی اپنے پیش

نظر رکھیں کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور سماجی اثر و رسوخ رکھنے والے طبقے کی ایک بڑی تعداد تقسیم کے زمانے میں نقل مکانی کر کے پاکستان جا چکی تھی۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ آزادی کے بعد شمالی ہند میں پے در پے ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کی معیشت کو بری طرح متاثر کیا اور جان و مال کا تحفظ اور دینی وملی تشخص کو برقرار رکھنا ان کی اہم ترین ترجیحات بن گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ملک کی آزاد فضا میں سانس لیتے ہوئے ہندوستانی سماج کے دیگر طبقات اور اکائیاں تعلیم اور معیشت کے میدانوں میں آگے بڑھ رہی تھیں مسلمان اپنی جان و مال کی حفاظت اور نان شبینہ کے انتظام میں مشغول تھے۔ اس کے بعد بھی اگر آج مسلمان تعلیم اور روزگار کے میدانوں میں دلتوں سے بھی پیچھے ہیں تو کیا تعجب ہے!

بہر حال، اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ تقریباً ایک صدی کی منظم، مستحکم اور مسلسل جد و جہد کے نتیجے میں فسطائی طاقتوں نے ملک کے طول وعرض میں اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر لی ہیں کہ ہنگامی طور پر چند مظاہرے اور احتجاجی جلوس، کچھ میمورنڈم اور تجاویز، اکا دکا کانفرنسیں اور لاطائل اخباری بیانات ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس کے لئے سنجیدگی کے ساتھ طویل المیعاد منصوبہ بندی کر کے ایک لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے کیونکہ فرقہ وارانہ فسادات کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر ریلیف ورک کے ذریعہ ہم وقتی طور پر چند خاندانوں کو ناگزیر فوری امداد تو پہونچا سکتے ہیں مگر اس عفریت کی یلغار کو روک نہیں سکتے جس کی زد میں آج نہیں تو کل ہم سب، یعنی تمام ہندوستانیوں، کو آنا ہے۔ میری رائے میں ملی قیادت، جس کے ساتھ ہم میں سے کچھ لوگ 'نام نہاد' اور 'لولی لنگڑی' کا سابقہ لگانا ضروری سمجھتے ہیں، اس سلسلے میں اہم پیش رفت کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ عجلت پسندی کی جگہ منصوبہ بندی اور قرارداد اور اعلامئے کی جگہ کارکردگی کی اہمیت عملاً تسلیم کر لے۔ آیئے اس قیادت کی تاریخ کا سرسری جائزہ لے کر اس کے عناصر ترکیبی اور نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ اس کی قوت ونفوذ اور کمزوریوں اور خامیوں کا پورا پورا ادراک ہو سکے۔

مگر ملی قیادت ہے کیا؟ میرے خیال میں سیاسی اقتدار کے عہد زوال میں یا اس کے کلیتہً خاتمہ کے بعد دانشوران قوم بالخصوص علماء کا مسلمانوں کے اجتماعی مسائل ومعاملات میں نئے خطوط پر رہنمائی کے لئے منظم کوششوں کو ہم 'ملی قیادت' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ 18 ویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ کی مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں سے علماء کی ملی قیادت کا پہلا دور شروع ہوا جو 19 ویں صدی کے وسط میں دیوبند نامی قصبہ میں ایک چھوٹے سے مدرسہ کے قیام پر ختم ہوتا ہے۔ 1857 میں اقتدار سے بے دخلی کے بعد مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تبدیل شدہ سیاسی اور معاشرتی حالات کے تئیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ان کا رویہ کیا ہو؟ آئندہ چار پانچ دہائیوں میں مسلم ڈسکورس تعلیم اور سماجی سدھار — میں یہاں دانستہ 'اصلاح معاشرہ' کی اصطلاح استعمال نہیں کر رہا ہوں کیونکہ اب اس کا استعمال بہت محدود مذہبی معنی میں ہوتا ہے — کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اس دور میں علماء نے ریئر گارڈ ایکشن یا رضا کارانہ پسپائی کی پالیسی اختیار کر کے اپنی سرگرمیوں کو مذہبی تعلیم اور عوام کی فقہی اور انفرادی دینی ضرورتوں کی تکمیل تک محدود کر لیا۔ عہد وسطیٰ کے برعکس پہلی بار عوام اور علماء میں قریبی روابط پیدا ہوئے۔ بادشاہ اور امراء کی سرپرستی سے محرومی کے بعد مسلمان اہل ثروت اور عوام نے علماء کی معاشی ضرورتوں کا بیڑا اٹھایا۔ روابط اور تعلقات میں ان بنیادی نوعیتوں کی تبدیلی کے بعد علماء اور عوام میں وہ مضبوط تعلق پیدا ہو گیا جس کا وجود بھی عہد وسطیٰ میں نہیں ملتا ہے۔ اسی وجہ سے ریاستی سرپرستی سے محرومی کے باوجود علماء نے اس دور میں جو زمینی اور ٹھوس کام انجام دئے وہ اپنے اثرات کے اعتبار سے ہمہ گیر بھی تھے اور دوررس نتائج کے حامل بھی۔

جدید تعلیم اور تہذیب کے فروغ کے لئے سرسید کی علمی اور تعلیمی کوششوں سے اعلیٰ ذات کے مسلمانوں میں ایک ایسا متوسط طبقہ

وجود میں آ گیا جس نے عہد وسطیٰ کے جاگیرداروں کے خاتمہ سے پیدا ہونے والے سماجی خلاء کو پر کیا۔ مگر سرسید سے فکری تعلق کے دعووں کے باوجود ملی محاذ پر یہ طبقہ ہمیشہ راسخ العقیدہ مذہبی طبقہ کی سند اور سرپرستی کا محتاج اور اس کے زیر اثر رہا۔ جدید ہندوستان میں ملی قیادت کا یہ پہلا سنگ میل تھا۔

جدید ہندوستان میں ملی قیادت کا دوسرا سنگ میل 'خلافت تحریک' تھا۔ اس تحریک نے علماء کو پہلی بار اپنی مقبولیت اور عوام میں نفوذ کو ایک نیم مذہبی نیم سیاسی مقصد کے لئے اجتماعی پلیٹ فارم سے استعمال کرنے کا موقع دیا۔ قوم پرست سیاسی جماعت نے بھی گاندھی جی کی قیادت میں ان کا ساتھ دے کر اس تحریک کو وقتی طور زبردست عوامی مقبولیت فراہم کردی۔

علماء کے حوالے سے اس تحریک کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلا کہ علماء جنگِ آزادی کی تحریک میں، جو گاندھی جی کی قیادت میں نظریاتی اور عملی ہر دو سطح پر ایک نیا رخ اختیار کر رہی تھی، ایک قوم پرست عنصر کی طرح شامل ہوگئے۔ خلافت تحریک کے دم توڑ دینے کے بعد بھی علماء مختلف تنظیموں اور اور انجمنوں کے پلیٹ فارم سے آزادی وطن اور ملت کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم رہے اور کسی سیاسی جماعت کے لیے، خواہ وہ قوم پرست کانگریس ہو یا مسلم علیحدگی پسند مسلم لیگ، انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔

آزادی کے بعد ملی قیادت کا تیسرا اور صبر آزما دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں حالات بہت ہمت شکن تھے اور ملی قیادت بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو بحال کر کے ان کی دینی شناخت کی بقا کے لئے کوشاں رہی۔ اس دور میں جب ملک کی تعمیر نو کا عمل - انتہائی وسیع معنوں میں - تیزی سے چل رہا تھا حالات کے جبر نے علماء اور دانشوروں کو ایک 'وفاقی ملی قیادت' کی ضرورت کا احساس دلایا اور 1965 میں 'آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت' کا قیام عمل میں آیا۔ مگر وسیع النظری اور وسیع المشربی کی کمی، معاصرانہ چشمک، تنظیمی رقابت، وغیرہ نے اس 'نمائندہ' پلیٹ فارم کو بہت جلد 'ملی سیاست' کے بساط میں تبدیل کر دیا۔

ساتویں دہائی کے نصف اول میں مسلمانوں کے سامنے وہ چیلنج سامنے آیا جو کسی بھی سیکولر جمہوریہ میں ایک مذہبی اقلیت کو دیر سویر پیش آ کر رہتا ہے۔ کورٹ کے ایک فیصلے کے خلاف ملی قیادت ایک بار پھر بقاء اور شناخت کی 'لڑائی' کے لئے 'آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ' کے نام سے منظّم ہوئی۔ اس بات کی خصوصی کوشش کی گئی کہ اسے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ حکومت کی نظروں میں بھی اسے جلد ہی ایک 'مسلم نمائندہ تنظیم' کی حیثیت حاصل ہوگئی اور مسلمانوں نے بھی اس تنظیم کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے اس کی آواز پر لبیک کہنا اپنا ملی فریضہ سمجھا۔ مگر ہمیں اعتراف حق کے باوجود اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ بورڈ کی معنویت، طریقہء کار، نمائندگی کے دعوے اور کارکردگی پر سوال اٹھتے رہے ہیں اور مسلکی شدت پسندی کی وجہ سے اس کا اعتبار بھی مجروح ہوا ہے۔ بورڈ کی تنظیمی ہیئت، ویژن کا غیر واضح یا یکسر معدوم ہونا، اور مسلکی و مشربی اختلاف کے نتیجہ میں اس پر ایک مخصوص مکتب فکر کے افراد کا حاوی ہونا اس کے اہم اسباب ہو سکتے ہیں۔ بورڈ کی معنویت اور ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے ایک ایسی عمومی بحث کی ضرورت ہے جس میں علماء، دانشور، صحافی، وکلاء، ماہرین قانون، طلبہ، اور عام مسلمان مسلک و مشرب کی تنگنائیوں سے اوپر اٹھ کر حصہ لیں تاکہ اس 'اجتماعی پلیٹ فارم' کو ایسی فرسٹ کلاس کا ویٹنگ روم بننے سے روکا جا سکے۔ لیکن اگر اس قسم کی کوئی کوشش نہیں ہوتی ہے اور ملی قیادت کے مختلف حلقے ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلاء رہتے ہیں تو یہ ملت کا بہت بڑا خسارہ ہوگا کیونکہ آج بورڈ ہی وہ واحد ادارہ ہے جو تمام مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اور اس دعویٰ کی سچائی کو پرکھنے کی بھی ایک ہی صورت ہے کہ ملی قیادت کے مختلف دھڑے ایک سنجیدہ مکالمہ کا آغاز کریں۔

بہر حال، پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے قیام میں آنے والی اس تنظیم نے رفتہ رفتہ اپنا دائرہ کار وسیع کرتے ہوئے بہت سارے مسلم مسائل ومعاملات کو اپنی سرگرمیوں کا حصہ بنالیا۔ گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں شاہ بانو کیس اور بابری مسجد کے حوالوں سے ملی قیادت سرخیوں میں رہی اور بعض 'قائدین' کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے دائیں بازو کی اس تحریک کو کمک ملتی رہی جو بالآخر بابری مسجد کی شہادت پر منتج ہوئی اور ملک میں ایک نئے سیاسی اور سماجی دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس سیاہ حادثے پر اب ربع صدی گزر چکی ہے۔ دائیں بازو کی تحریکوں نیاس وقفہ میں ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ اپنی تنظیمی قوت، اتحاد، عمدہ کارکردگی اور منصوبہ بندی کے ذریعہ اب وہ اس پوزیشن میں آچکے ہیں جہاں وہ آر ایس ایس کے نظریات کو عملی جامہ پہنا کر ہندوستانی جمہوریہ کی فلسفیانہ اساس کو بدلنے کے عزم کا برملا اظہار کررہے ہیں۔ جہاں تک ہماری ملی قیادت کا تعلق ہے تو وہ اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہے کہ بعض استثنائی مثالوں کیوہ اب بھی شناخت رخی انفعالی ملی سرگرمیوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کافی سمجھتی ہے، اور اتحاد امت کے لئے گلوگیر آواز اور پرنم آنکھوں کے ساتھ طویل دعاؤں کے باوجود اجتماعی مسائل میں بھی اپنے ذوق ومشرب کو حق وصداقت کا معیار سمجھتی ہے۔

فرقہ پرستی اور ملی قیادت: چند گذارشات:

1۔ ملی قیادت کے لئے اس حقیقت کا ادراک اور اظہار ضروری ہے کہ فرقہ پرستی کے دو پہلو ہیں: خارجی اور داخلی۔ خارجی سے مراد یہ ہیکہ فرقہ پرستی صرف مسلمانوں کا داخلی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ پورے ہندوستانی سماج کا مسئلہ ہے۔ ہمیں نظری اعتبار سے اس بات کا برملا اظہار کرنا چاہئے کہ یہ مسئلہ کسی مخصوص فرقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے ملک کی سالمیت، امن وامان، اور خوشحالی وترقی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی طرح اس نزاکت کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ہم اکثریتی فرقہ پرستی کو اقلیتی فرقہ پرستی کے ذریعہ حل نہیں کرسکتے ہیں۔ فرقہ پرستی اپنی اصل اور بنیاد کے اعتبار سے ایک ہے اور اس کی ہر قسم اپنے مخالف کیمپ کی فرقہ پرستی سے غذا حاصل کرتی ہے۔ وہ تمام عناصر بد جو فرقہ پرستی کو اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں ان سے ملی قیادت واضح الفاظ اور دوٹوک لہجے میں اپنی بے زاری اور برات کا اظہار کریخواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب اور ذات سے ہو۔ اور سماج کے وہ تمام طبقات جو فرقہ پرستی سے متاثر ہوتے ہیں وہ ملی قیادت کی ہمدردی کے مستحق ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب اور ذات سے ہو۔ اس سلسلے میں بیچ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

2۔ اسی طرح ملی قیادت کو اپنے دائرۂ کار کی محدودیت کا احساس بھی ہونا چاہیئے۔ فرقہ پرستی ایک کثیر الجہات اور کثیر الابعاد مسئلہ ہے۔ رسل ورسائل اور تعلیم کے عموم، اکہرے شناخت کا فزوں تر احساس، عالمی سیاست کے بساط پر مسلمانوں کی پوزیشن، اور ان جیسے متعدد سماجی، سیاسی اور معاشی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے فرقہ پرستی روز بروز ایک زیادہ پیچیدہ مسئلہ کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس کیحل کے لئے پارلیمنٹ سے لے کر سماجی اداروں تک، مذہبی پیشواؤں سے لے کر مذہب بیزار مگر انسان دوست طبقات تک، انتظامیہ سے لے کر دانشوران تک اور طلبہ ونوجوانوں سے لے کر خواتین اور مزدوروں تک ہر ایک کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ ہماری سمٹی سمٹائی ملی قیادت اس سلسلے میں سب کچھ نہیں کرسکتی ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ خواہ وہ جتنا بھی کرے، جو وہ کرسکتی ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔

فرقہ پرستی کا داخلی پہلو یہ ہے کہ ملک میں ایک طبقہ نظری اور عملی اعتبار سے اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو اعلا ذات کے ہندوؤں کی تہذیب وثقافت کو، جسے انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ 'ہندوستانی تہذیب' کہا جاتا ہے، اپنانا چاہئے۔ اس بات کو ملک سے ان کی محبت اور وفاداری کے لئے اب معیار بنا دیا گیا ہے۔ اس نظریئے کے مطابق مسلمان کبھی بھی اپنے

عقیدہ واخلاقی نظام، مذہبی تصورات اور معاشرتی رسوم ورواج کے ساتھ اس ملک کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ اس بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو انہیں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت حاصل ہوگی۔ سنگھ پریوار نے فرقہ پرستی کو اپنی جارحانہ 'تہذیبی قوم پرستی' کی تبلیغ واشاعت کے لئے ایک طریقۂ کار کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے مسلمان اپنے مذہب، اس ملک میں اپنی تاریخ، اور جدید ہندوستان کے مختلف سیاسی اور سماجی واقعات کی وجہ سے اس پالیسی کے لئے تختۂ مشق بنتے ہیں، اس لئے فرقہ پرستی کے کڑوے کسیلے پھل بھی سب سے زیادہ انہیں کی جھولی میں آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ان کا داخلی مسئلہ ہے۔

3۔ اگر ملی قیادت فرقہ پرستی کے اس رتھ کی پیش رفت کو روکنے میں واقعی سنجیدہ ہے تو اسے ہندوستانی سماج کے متعلق علٰحیدگی پسندی کے اپنے دیرینہ رویے میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگا۔ یہ مسلم سماج کے مذہبی طبقہ کا ایک 'واشگاف راز' ہے کہ وہ دین و دل کے تحفظ کی خاطر ان کی گلی میں جانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا ہے۔ یہ شناخت رخی ملی قیادت کا نتیجہ ہے اور اس پر نظر ثانی کا وقت آ گیا ہے۔ اب ہم 'دینی تشخص' والے دور سے آگے آ چکے ہیں۔ نئی نسل میں ،بحیثیت مجموعی، اپنی روایات سے وابستگی ان نسلوں سے زیادہ ہے جو استعماری فکری غلامی کے دور میں پروان چڑھیں، اس تبدیلی کے متعدد اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ عالمی سطح پر بھی یہ دور علاقائی اور مذہبی قدروں کی بازیافت کا دور ہے۔ بہر حال، اس بات کا اعتراف کشادہ دلی کے ساتھ کیا جانا چاہئے کہ ملی قیادت نے اس تشخص کو باقی رکھنے میں زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ مگر اب ہمیں اس سے آگے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نفرت کے علمبردار فسطائی جماعتوں کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ مسلمان ہندوستانی سماج میں زندگی کے حاشیہ پر رہیں۔ یہ بات کہ سماج میں ہر طرف ہمارے خلاف سازشوں کے جال بچھے ہیں اور ہم اگر اپنے دین وایمان کی خیر چاہتے ہیں تو جتنا ممکن ہو ہم سماجی سرگرمیوں اور برادران وطن سے میل جول سے دور رہیں، اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ کسی اقلیت کے لئے اس سے بھیانک غلطی اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ وہ خود یہ 'سماجی مقاطعہ 'اختیار کر لے۔ ملی قیادت کو صاف لفظوں میں مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہئے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول میں ایک نافع اور فعال عنصر بن کر رہیں۔ وہ جس بستی، محلّہ، شہر، کالونی، دفتر اور ادارے میں ہوں وہاں محنت وایمانداری اور اعلا کارکردگی کا معیار بننے کی کوشش کریں اور خود کو اس فوری اجتماعیت کے لئے ناگزیر ثابت کر دیں۔ سماج کے دبے کچلے مظلوم طبقات کے ساتھ بالخصوص اور دیگر تمام لوگوں کے ساتھ بالعموم ان کے رنج وغم اور خوشی وتہوار میں شرکت کے راستے تلاش کریں اور دوسروں کی خدمت کرنے اور ان کے کام آنے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہیں۔

لیکن فکر وعمل میں یہ بنیادی تبدیلی صرف اعلامیے، تجاویز، اور اخباری بیانات سے پیدا نہیں ہوگی۔ کیونکہ حق تو یہ ہے کہ مذکورہ باتیں ملی قیادت کی دستاویزات میں ہر جگہ مل جاتی ہیں۔ مگر عملاً عام مسلمانوں میں ان کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا ہے۔ میری رائے میں اس کی دو اہم وجہ ہے: ملی قیادت کی پالیسی اور پروگرام کا عوام تک عدم ترسیل وتذکیر اور ملی قائدین کی انفرادی واجتماعی زندگیوں کا ان باتوں سے خالی ہونا۔ اس لئے ان دونوں کا تدارک ضروری ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ ملی قیادت کے پاس مساجد، مدارس، اردو اخبارات اور دینی مجالس کی صورت میں ایک طاقت ور اور بہت حد تک ہمدرد اور حساس ابلاغی نیٹ ورک ہے۔ سالانہ اجلاس، عمومی وخصوصی میٹنگز وغیرہ کے اعلامئے، تجاویز اور قرارداد کی مسلسل ترسیل اور تذکیر ضروری ہے۔ جمعے کے خطبے، وعظ کے مجالس اور مدارس کے جلسے میں ان نکات پر گفتگو کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس روایتی ابلاغی نیٹ ورک کی اہمیت اور نفوذ کی اہمیت کو کم سمجھنا دنادانی ہوگی اور ان کا مناسب استعمال بصیرت کا عکاس۔

مگران اعلانات، پالیسی اور لائحہ عمل کی تشہیر، اور منظم طریقے سے اس کی افہام وتفہیم سے بھی اس وقت تک کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا اگر ملی قیادت کے نمایاں چہرے اپنی انفرادی زندگیوں میں بھی اور اجتماعی طور پر بھی ان باتوں کی عملی تصویر پیش نہیں کریں۔ ملی قیادت جس وسیع المشربی اور وسعت قلبی کا عام مسلمانوں اور ملک کے دیگر لوگوں سے مطالبہ کرتی ہے اسی کی امید عوام بھی ملی قیادت سے کرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ملی قیادت سماج کے ہر طبقے کے مسائل اور حقوق کے لئے نظریاتی سطح پر اپنی آواز بلند کرے اور ہندوستانی سماج کے حاشیے پر زندگی گزار رہے مظلوم لوگوں کی مؤثر آواز بننے کی کوشش کرے۔ ملی قیادت اپنی کانفرنسوں، اجتماعات، ادارے، مساجد، اور مدارس میں ہونے والے ڈسکورس کو ملی فریم ورک کے بجائے انسانی فریم ورک میں فٹ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مساجد، مدارس، ملی تنظیمیں، مسلمانوں کے زیر انتظام ادارے، دفاتر، وغیرہ، روزمرہ کے لین دین اور میل جول میں جاہلی حمیت اور قوم پروری کے زعم میں عدل واخلاق اور ضمیر وکردار کا سودا صرف اس لئے نہ کریں کہ ان کے مقابل ایک غیر مسلم ہے۔

4۔ ملی قیادت کو یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اس وسیع النظری کے لئے ہنگامی حالات کو اخلاقی بنیاد بنانا دانشمندی نہیں ہوگی۔ اس کے لئے قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ کی طرف رجوع کیا جانا چاہئیتا کہ اس منبع فیض سے ایک ایسی 'سماجی دینیات' ابھر کر سامنے آئے جس میں اولعزمی، رواداری، کردار کی پختگی، خلق خدا سے محبت اور ان کی خدمت کا جذبہ ابھرا ہوا ہو اور جسے اختیار کر کے ہندوستانی مسلمان سماجی زندگی کا ایک فعال اور حصہ دار رکن بن کر اٹھے نہ کہ ان کے نام سے گداگروں کی ٹولی کا تصور ابھرے۔

5۔ ملک میں انصاف پسند اور جمہوریت دوست لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کے خلاف اس طویل جدوجہد میں جتنے زیادہ لوگ اس قافلہ میں شامل ہوجائیں، اتنا اچھا ہے۔ ایسے لوگ جن کے لئے اکثر 'خاموش اکثریت' کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے ملک میں واقعتاً اکثریت رکھتے ہیں مگر ہندوستانی سماج کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کا لبرل یا روشن خیال طبقہ کا تعلق اکثر سماجی سروکار سے کم ہی ہوتا ہے۔ اس طبقہ کو اگر فرقہ پرستی کے حوالے سے ملی قیادت متحرک کردے تو یہ ملک کی بڑی خدمت ہوگی۔

6۔ ملی قیادت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ماہرین تعلیم اور بالخصوص ماہرینِ تاریخ اور آثار قدیمہ پر مشتمل ایک واچ ڈوگ کی تشکیل کرے جو اسکولی نصاب کے مواد پر کڑی نظر رکھے۔ نفرت انگیز اور تاریخ کی غلط تعبیر وتشریح کرنے والے مواد کی فوری گرفت کرے اور ملی قیادت اس مسئلے کو آئینی اور علمی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کرے۔

7۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ملی قیادت اور مسلم دانشوروں کی گفتگو میں دائیں بازو کی انتہا پسند تنظیموں کا عنصر جتنا 'کثیر' ہوتا ہے ہمارے پاس ان کے نظریات، ممتاز شخصیتوں، اداروں اور سرگرمیوں سے متعلق تحقیقی اور بلا واسطہ معلومات اتنی ہی 'قلیل' ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملی قیادت علاقائی اور مرکزی سطح پر ایک ایسا میکنزم تیار کرے جس سے ہمیں ان تنظیموں کی سرگرمیوں کا کچا چٹھا مستند ذرائع سے معلوم ہوتا رہے۔

8۔ ملی قیادت کے لئے اس حقیقت کا ادراک بھی لازم ہے کہ فرقہ پرستی کے خلاف لڑائی ایک طویل لڑائی ہے۔ اس کے خلاف علامتی جدوجہد کا اس وقت تک کوئی مطلب نہیں ہے جب تک اس کے پیچھے طویل اور منصوبہ بند لڑائی کا خاکہ نہ ہو۔ یہ ایک چومکھی لڑائی ہے کیونکہ کے مخالفین نے بیک وقت کئی محاذ کھول رکھے ہے اور ہر محاذ ہماری توجہ اور کوششوں کا طالب ہے۔

☆☆☆

❑ اقامت دین

دور حاضر میں اقامت دین ایک اہم فریضہ

نسرین فاطمہ
ریسرچ اسکالر، شعبہ سنّی دینیات، اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ

اقامت دین کی فرضیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے قرآن حکیم اور نبی ﷺ کے اسوہ کا جائزہ لینا چاہئے۔ اسکے بعد صحابہ کرام اور تابعین اور تاریخ اسلام کے بزرگوں کی سیرت و خدمات اور قربانیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قرآن کریم میں اقامت دین کی فرضیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

'' و اذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفه''[1]

ترجمہ: پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں'

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"قلنا اهبطوا منها جميعافاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم و لا هم يحزنون..... ۲۱

ترجمہ: ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے انکے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اسکو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

ان آیات کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات میں اقتدار صرف اللہ ربّ العالمین کا ہے۔ دوسری بات یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے ذمہ دار اسکے نائب انبیا علیہم السلام ہیں۔ حضرت آدمؑ سے لیکر آنحضرت ﷺ تک سارے انبیاء خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز تھے۔ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئیگا اسلئے اب یہ ذمہ داری امت محمدیہ پر فائز ہے۔ کہ وہ خدا کے دین کو قائم رکھیں۔ لیکن اگر آج دیکھا جائے تو معاشرے میں فساد رونما ہے معیشت میں حلال حرام کی تمیز ناپید ہوتی جارہی ہے۔ سیاست اور اجتماعیت کا ہر پہلو داغدار ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رگ رگ میں خدا فراموشی اور دنیا پرستی ہے لوگوں کے دلوں میں غلامی کا طوق پڑا ہے اور انسانیت دن بدن تباہ ہو رہی ہے۔ ایک انسان دوسرے کا خون بہانے میں کوئی گناہ تصور نہیں کرتا۔ شراب، چوری، جوا، سب عام اور فیشن بن گیا ہے۔ ایسے پُر خطر حالات میں صرف اپنی ذہنی اور اخلاقی تربیت کافی نہیں ہے بلکہ پورے معاشرے کی اصلاح ضروری ہے اور اللہ کے دین کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں اگر صرف ہم اپنی ہی اصلاح اور تربیت میں لگے رہیں گے اور سماج کو سدھارنے کی فکر نہیں کریں گے تو یہ خود غرضی ہے۔ اور اس طرح اپنی تربیت بھی کبھی مکمل نہ ہوگی۔ کیونکہ جب چاروں طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہونگے تو صرف اپنی رہائش گاہ کو صاف ستھرا رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ بلکہ انفرادی، سماجی اور اجتماعی اصلاح اور سدھار از حد ضروری ہے۔

اقامت دین کا اصل مقصد ہی خلوص وللّٰہیت کے ساتھ ہر فرد کو اپنے اپنے طور پر دین کو قائم کرنا اور غیر اللہ کی طاقت کو زوال پزیر

کرنا ہے، اسکے لئے ہمیں انبیا کرام کی سیرت اور تاریخ میں راہیں ملتی ہیں کہ کس طرح انہوں نے اللہ کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر کے دکھایا۔ انفرادی طریقہ کے علاوہ اجتماعی طریقہ زیادہ پر اثر ہوتا ہے اسلئے اجتماعی طور پر بھی اقامت دین کو قائم کرنا ہوگا۔

اقامت دین نا صرف ایک فریضہ ہے بلکہ یہ تو ام الفرائض ہے۔ اقامت دین کا مطلب ہی یہ ہے کہ خدا نے جو صحیح قرار دے دیا ہے اسکو پھیلایا جائے اور جس سے منع کیا ہے اس سے معاشرے کو پاک کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔

"کنتم خیرامة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تومنون بالله"۳

ترجمہ: تم بہترین امت ہو لوگوں کے لئے برپا کیے گئے ہو تم بھلائی کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے باز رکھتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"

خیر کی دعوت دینا، بھلائیوں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا یعنی دین قائم کرنے کی کوشش کرنا پوری امت کا فریضہ ہے یا کم از کم امت مسلمہ میں ایک منتخب جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جسکا کام اقامت دین ہو، اقامت دین جسکی زندگی کا مقصد اور نصب العین ہو۔ جو اقامت دین کے لئے مرے اور جیئے، واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی فلاح و بہبود اور آخرت کی کامرانی اقامت دین کی جدوجہد پر ہے۔

اقامت دین ایک ایسا فریضہ ہے جسکا حکم تمام انبیاءؑ کو دیا گیا۔

"شرع لکم من الدین ما وصیّ به نوحاًوّالّذی او حینا الیك وما وصّینا به ابراهیم و موسی و عیسی ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیه"٤

ترجمہ: اسنے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جسکا حکم اسنے نوح کو دیا تھا، اور جسے اب (اے محمد ﷺ) تمہاری طرف وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جسکی ہدایت ہم ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، کہ قائم کرو اس دین کو اور اسمیں متفرق نہ ہو۔

یعنی مومن مرد اور خواتین سب کا نصب العین ایک ہی ہے "اقامت دین" اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقامت دین کی راہ میں ایک دوسرے کے رفیق اور معاون رہیں کیونکہ ایمان والوں کا مشترکہ فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے یہی مقصود رفاقت ہے اور یہی بنائے رفاقت ہے۔ خود قرآن اسکے بارے میں فرماتا ہے۔

"و المومنون و المومنات بعضهم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر"٥

ترجمہ: مومن مرد اور مومنہ خواتین ایک دوسرے کے رفیق ہیں وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے باز رکھتے ہیں"

مولانا سلیمان قاسمی اپنی تصنیف "اصلاحی تقریریں" میں اقامت دین کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"دین کا پیغام اور سچائی کی دعوت وہ فریضہ ہے جسکا حکم دیا گیا ہے اس فریضے کو بغیر کسی اینچ پینچ کے صاف، کھلم کھلا، اور بانگ دہل انجام دینا چاہئے کیونکہ جرأت ایمانی کا تقاضہ ہے کہ ہر حال میں سلیقے سے صاف اور واضح انداز میں حق پیش کیا جائے۔ کسی مداہنت، سستی، یا کتر بیونت سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔ ہر فرعون کے دربار میں موسیٰ اور ہارون کے پیرووں کا جانا ضروری ہے مگر قول لیّن نرم بات کہنا بھی ضروری ہے چنانچہ فرمایا: فاصدع بما تومر۔ یعنی جس بات کا حکم دیا گیا ہے اسے صاف صاف بیان کرو۔"٦

اللہ تعالی نے اپنے دین کو محدود زمانے یا مخصوص قوم کے لئے نہیں بھیجا بلکہ سارے عالم کے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے اور اس نظام حیات یا نظام اسلام کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ یہ من وعن ہر دور میں آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتا رہے چاہے اس پیغام کو عام کرنے کے لئے کتنی ہی تکالیف اور آزمائشوں سے گزرنا پڑے، اس راہ میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں۔ ہر حال میں اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے اور یہی خدا کی طرف سے آزمائش ہے جیسا کہ قرآن

پاک میں ارشاد ربّانی ہے:

"احسب الناس ان یترکو ان یقولو امنّا وھم لا یفتنون ولقد فتنا الذین من قبلھم"۷

ترجمہ: کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم ایسے ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے۔اور تمہیں آزمایا نہیں جائیگا۔حالانکہ تم سے پہلے کی قوموں کو بھی آزمایا جاتا رہا۔

اقامت دین کی اہمیت کا اندازہ امام ترمذی کی اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جسکو انہوں نے باب 'ما جاء فی الامر بالمعروف ونھی عن المنکر میں بیان کیا ہے۔

"عن حذیفہ بن یمان ،عن النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال:والذی نفسی بیدی لتامرنّ بالمعروف وتنھونّ عن المنکر أو لیوشکن اللہ أن یبعث علیکم عقابامنہ ثم تدعونہ فلا یستجاب لکم "۸

ترجمہ: حذیفہ بن یمان سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے تم اچھی باتوں کا حکم کرتے رہو اور برائی سے روکتے رہو اگر تم ایسا نہیں کروگے تو اللہ تعالی تم پر عذاب بھیج دیگا پھر تم اللہ سے دعائیں مانگو گے پر وہ قبول نہیں کریگا''

اسی طرح ہر فرد کو اپنے اپنے طریقہ سے برائی کو روکنا اور بھلائی کو پھیلانا ضروری ہے ۔یعنی جسکے اندر جتنی استطاعت ہے وہ اقامت دین کو اسی لحاظ سے کرے چاہے تو پورے قافلہ کے ساتھ اس فرض کو انجام دے یا تن تنہا؛ کیونکہ کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی برائی کو دیکھ کر چپ بیٹھا رہے بلکہ جب اس برائی کو دیکھے تو اسے دور کرنے کی کوشش کرے اور اسکو دور کرنے کے لئے اپنے ہاتھ اپنی زبان اور اپنی ہر تدبیر کو آزما سکتا ہے لیکن اگر انتھک کوشش کے باوجود بھی برائی ختم نہیں ہوتی یا برائی کرنے والا اپنی برائی سے باز نہیں آتا تو اپنے دل میں اس برائی کو برا جاننا چاہئے۔اور دوسرے لوگوں کو اس سے دور رکھنا چاہئے۔

جیسا کہ حدیث رسول ﷺ میں وارد ہے؛

"من رای منکم منکراً فلیُغیّرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ و ذالك اضعف الایمان"۹

ترجمہ:تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر سکت نہ ہو تو اپنی زبان سے اسے بدلنے کی کوشش کرے،اور اگر سکت نہ ہو تو اسے اپنے دل سے بدلنے کی کوشش کرے،اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

برائیوں کو مٹانا،اور انکی جگہ حق کو قائم کرنا ضروری ہے اور فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔اور زندگی کے کسی بھی پہلو میں کوئی بھی برائی ہو اسکو مٹانا اور اسکی جگہ حق قائم کرنا ضروری ہے۔اس حدیث سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ صرف برائی کو مٹانا کافی نہیں بلکہ اسکی جگہ اچھائی کو قائم کرنا لازمی ہے۔یعنی ابطال باطل اور احقاق حق دونوں ضروری ہیں۔

لیکن ساتھ ہی اسلام یہ بھی کہتا ہے باطل کو باطل اور حق کو حق ثابت کرنے کے بعد اب کسی پر جبر نہیں کہ اسکو زبردستی اسلام قبول کرایا جائے یا اس پر احکام مسلط کئے جائیں بلکہ حق کی تبلیغ با قائدہ طریقہ سے جاری رکھی جائے لیکن داعی حق کو اس امر کی کوشش نہ کرنی چاہئے کہ منکرین کو زبردستی دائرہ اسلام میں لے آیا جائے کیونکہ یہ کام صرف خدا واحد کا ہے وہ جسکو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"ولو شاء ربّك لامن من فی الارض کلھم جمیعاً افأنت تکرہ الناس حتی یکونو ا مومنین"۱۰

ترجمہ:اور اگر تیرا رب چاہتا تو بے شک ایمان لے آتے وہ تمام لوگ جو زمین میں ہیں پھر کیا تم زبردستی کروگے لوگوں پر جس سے کہ وہ مومن ہو جائیں۔

ایک دوسری جگہ اللہ ربّ العزّت نے نبی ﷺ کو مخاطب کرتے

ہوئے ارشاد فرمایا۔

"فذکّر انّما انت مذکّر لست علیهم بمصیّطر الّا من تولّی و کفر فیُعذّبه اللّه العذاب الاکبر" ۱۱

ترجمہ: پس آپ انکو سمجھایئے آپکا کام یہی سمجھانا ہے۔آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں چنانچہ جس نے حق سے روگردانی کی اور کفر کیا تو اللہ اسکو بڑی سزا دیگا۔

دعوت دین کا عمل دو بڑے ذرائع سے تکمیل تک پہونچتا ہے۔ ایک قولی دوسرا عملی۔ پہلے عمل کو اللہ نے قرآن میں فرمایا 'ومن احسن قولا ممن دعا الی اللّه و عمل صالحاً و قال انّنی من المسلمین "۱۲

ترجمہ: اور اس سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک اعمال کئے اور کہا میں مسلم ہوں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:"ادعُ الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة "۱۳

''اپنے رب کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ''

دوسرے طریقہ عملی یعنی دین کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو اللہ تعالی خوشخبری سناتا ہے۔

"وجوهٌ یومیذ ناعمه لسعیها راضیه" ۱٤

ترجمہ: کچھ چہرے اس روز بارونق ہونگے۔اپنی کارگزاری پر خوش ہونگے۔

اب یہ جدوجہد قلم سے لیکر جان و مال کی قربانی تک کا تقاضہ کرتی ہے اس راستے میں بہت سی مشکلات ہیں جنکا سامنا کرنا مومن کے لئے ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی کامیابی بنا مشکلات کے ہاتھ نہیں آتی اور یہ تو اقامت دین کا مسئلہ ہے۔اس راہ میں شیطان طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتا ہے تاکہ خدا کا دین نہ قائم ہو جائے اور تمام لوگ گمراہی کے راستے میں پڑے رہیں لیکن ایک مومن کی شان یہی ہے کہ ان تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے اللہ کے دین کو قائم کردے چاہے اس راہ میں کتنی ہی آزمائش کیوں نہ ہو کیوں کہ ان آزمائشوں اور جدوجہد کے سبب اللہ تعالی بہت بڑی خوشخبری سناتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"انّ اللّه اشتریٰ من المومنین انفسهم واموالهم بانّ لهم الجنه یقاتلون فی سبیل اللّه فیقتلون و یقتلون وعداً علیه حقاًفی التورات والانجیل والقرآن ومن اوفی بعهده من اللّه فا ستبشروا ببیعکم الّذی بایعتم به و ذالك هو الفوزالعظیم" ۱۵

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے انکی جان اور انکے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے اور مرتے ہیں ان سے اللہ کا پختہ وعدہ ہے تورات، انجیل، اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر عہد کو پورا کرنے والا ہو پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو اللہ نے تم سے کیا ہے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دعوت و تبلیغ کے بارے میں نصیحت فرمائی کہ ''چاہئے جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک ہر بات پہنچا دیں جو حاضر نہیں ہیں۔کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ حاضر انہیں ایسے شخص تک پہنچا دے جو انہیں پہنچانے والے سے زیادہ یاد رکھے'' ۱۶

فریضہ اقامت دین اسلام کی عمارت تعمیر کرنے کے مقاصد میں سے ایک اہم ترین مقصد ہے فریضہ اقامت دین کے بنا اگر اسلام کی بنیاد کھڑی کی جائے تو وہ ایسی ہوگی جیسے جنگل میں ایک بے مصرف اور ویران عمارت کھڑی ہے اور یہ عمارت جلد ہی بوسیدہ ہو جائے گی۔اور اسمیں فسق و فجور کو قدم جمانے کا موقع ملے گا۔ہر حال میں ہمیں داعیانہ کردار ادا کرنا چاہئے۔کیوں کہ حضور ﷺ اور آپؐ کے واسطے سے تمام مسلمانوں کو جو جگہ جگہ حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو اور اپنے برادران وطن کو اسلام کی دعوت دیں۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"ادع الیٰ سبیل ربّك بالحکمة والموعظة الحسنة و جادلهم بالّتی هی احسن "۱۷

ترجمہ: یعنی اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور انسے بہترین طریقہ پر بحث کرو۔

اقامت دین کے اس فریضہ کو قرآن مجید شہادت حق سے تعبیر کرتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے:

"و کذالك جعلنکم امّة وسطاً لّتکونوا شهداء علیٰ النّاس و یکون الرّسول علیکم شهیداً"۱۸

ترجمہ: اور اس طرح ہم نے تمکو بہترین امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

یعنی وہ لوگ جو اللہ کے دین کو قائم کرتے ہیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں تو قیامت کے دن وہ لوگوں پر گواہی دینگے کہ ہم نے اپنا حق ادا کر دیا اور رسول ﷺ بھی ان پر گواہ ہونگے کہ انہوں نے دین اسلام کا حق ادا کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالی نے حضور ﷺ کے بعد یہ ذمہ داری امت محمدیہؐ کے اوپر ڈالی۔ اس ذمہ داری کو شہادت حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلئے کہ نبیؐ نے عدل حقیقی اور اقامت دین کو اپنے قول اور فعل سے قائم کیا۔

اقامت دین اولین اور اہم ترین فریضہ ہے اسکا مقام فرائض میں جنس اعلی اور کلیۃ الکلیات ہے جو دوسرے فرائض پر حاوی ہے مسلمانوں کی دنیوی و اخروی سعادت اور اسلام کی دعوت، غلبہ و اقتدار کا انحصار اقامت دین پر ہے۔

اگر آج دیکھا جائے تو مسلمان غالب کے بجائے مغلوب قوم کی حیثیت سے اگر باطل کا شکار ہو رہے ہیں تو اسکی بنیادی وجہ ہمارا اس ذمہ داری سے غفلت برتنا ہے۔

اگر چہ دین اسلام وہ بہترین نظام ہے جو انسانیت کو دیا گیا ہے مگر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اہل دنیا کی اکثریت اس بہترین نظام سے غافل اور دوسری طرز ہائے زندگی کو اپنائے ہوئے ہے جسکی وجہ سے انسانیت روز بروز تنزلی و پستی کے قعر میں گرتی چلی جا رہی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلام کے مکمل نظام حیات پر عمل پیرا ہوں اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اسکی تعلیمات کو مشعل راہ بنائیں۔

حواشی:

۱۔سورۃ البقرہ:۳۰

۲۔سورۃ البقرہ:۳۸

سورۃ الشوری:۱۳

۵۔سورۃ توبہ ۱۷

۶۔اصلاحی تقریریں۔سلیمان قاسمی۔ص ۱۴۴

۷۔سورۃ العنکبوت۔۲۔۳

۸۔سنن ترمذی۔کتاب الفتن، باب ماجاء فی الامر بالمعروف و النھی عن المنکر۔حدیث نمبر ۲۱۶۹

۹۔ترمذی شریف۔باب ماجاء فی تغیر المنکر بالید أو باللسان او بالقلب کتاب الفتن حدیث نمبر ۲۱۷۲

۱۰۔سورۃ یونس آیت ۹۹

۱۱۔سورۃ الغاشیہ۔۲۱۔۲۴

۱۲۔حم السجدہ۔۳۳

۱۳۔سورۃ النحل آیت ۱۲۵

۱۴۔سورۃ الغاشیۃ ۸۔۹

۱۵۔سورۃ التوبہ۔۱۱۱

۱۶۔www.kitabosunnat.com-online

۱۷۔سورۃ النحل:۱۲۵

۱۸۔سورۃ البقرہ:۱۴۳

☆☆☆

❑ مردانِ حُر

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار و مخلص دوست

تحریر: عبدالمنعم الہاشمی ترجمہ: عالم مراد آبادی

حضرت زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی اور حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ آپ صلی اللہ کو زبیر سے بے پناہ محبت تھی۔ اور زبیر کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ کبھی آپ کی جدائی برداشت نہیں کرتے۔ ہمہ وقت خدمتِ اقدس میں حاضر رہتےلیکن اس کے باوجود آپ سے زیادہ حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ ایک روز آپ کے فرزندان میں سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ فلاں فلاں شخص کی طرح احادیث کیوں بیان نہیں کرتا آپ نے فرمایا: میں نے رسولِ پاک کو کہتے سنا ہے کہ جس شخص نے میری جانب کسی جھوٹ کی نسبت کی تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

آپ صلی اللہ سے زبیر رضی اللہ عنہ کے لگاؤ کا عالم اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک روز وہ رسول اللہ کو موجود نہ پا کر بے چین ہو گئے، افواہیں پھیلانے والے لوگ خوب غلط سلط خبریں اڑا رہے تھے۔ اس صورتِ حال سے حواس باختہ ہو کر زبیر نے تلوار اٹھائی اور مکہ کے گلی کوچوں میں گھومنا شروع کر دیا اور ساتھ میں یہ آواز بھی لگائی اگر کسی قریشی نے رسول اللہ پر زیادتی کی ہوگی تو آج قبیلہ قریش کے سروں کو میں ان کے جسم سے الگ کر دونگا۔ آپ کو تلاش کرتے کرتے مکہ جبلیہ پہاڑ کی کھوہ میں پہنچ گئے جہاں آپ صلی اللہ نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ نماز سے فارغ ہوئے اور فرمایا زبیر کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہو؟ آپ نے پورا ماجرا کہہ سنایا اور فرمایا کہ میں اس ارادہ سے آیا تھا کہ جس شخص نے آپ کو کوئی گزند پہنچائی ہوگی اپنی تلوار سے اس کا سر اتار ونگا۔ آپ صلی اللہ کی زبانِ مبارک سے زبیر کے لئے دعائیہ کلمات نکلے اور فرمایا ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے (معاون و مددگار) اور میرے حواری اے زبیر تم ہو۔

پیدائش و نشوونما:

حضرتِ زبیر کے والد العوام اپنی قوم کے بااثر سردار اور محترم شخصیت تھے۔ ام المؤمنین سیدہ خدیجہ کے بھائی تھے اس رشتہ سے ام المؤمنین آپ کی پھوپھی ہوئیں۔

نسب:

زبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی بن غالب۔

آپ کی والدہ صفیہ بنت عبد المطلب ہیں اس رشتہ سے ابوطالب وحمزہ رضی اللہ عنہ اور انکے برادران آپ کے ماموں ہوئے۔

ایامِ طفولیت ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماں نے تربیت کی۔

حضرتِ صفیہ اپنے بھائی حمزہ کی بہادری اور جرأت مندی سے متأثر تھیں۔ لہذا بیٹے کو بھی اسی انداز کا بہادر دیکھنا چاہتی تھیں۔ بیٹے

کولڑکپن کے ناز ونخرے سے دور رکھا اور میدان کارزار وشکار کرنے کا دھنی بنایا. ایک روز ایک ڈنڈے سے بیٹے پر پل پڑیں تا کہ اس کی قوتِ بازو کا اندازہ کر سکیں حضرت زبیر بغیر کسی آہ و بکا اور چیخ و پکار کے ڈنڈے کی مار سے اپنا دفاع کر رہے تھے. تماشا بیں حضرات آپ کو سخت دل اور بے رحم ماں کہہ کر چڑھا رہے تھے. حضرت صفیہ نے اپنا دفاع کرتے ہوے جواب دیا! اے لوگو تم کو صفیہ کا ظلم دکھ رہا ہے کیا صفیہ کے بیٹے کی مضبوطی نہیں دکھ رہی ہے. میں اس کو ایک ایسا جوان دیکھنا چاہتی ہوں جو اپنے مدمقابل کے سامنے کمزور نہ پڑے. جس کے بازو فولادی ہوں صفیہ کا شفقتِ مادر سے کوئی واسطہ نہیں جب تک کہ اس کے بیٹے کا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جائے جو حوادثات وخطرات سے کھیل جاتے ہیں۔

زبیر جوان ہو گئے. اور قوتِ بازو بھی مضبوط ہو گئے۔ گھڑ سواری میں مہارت پیدا ہوگئی. تلوار زنی نیزہ بازی تیر اندازی میں کمال آ گیا. گھوڑوں پر سوار ہونا میدانِ جنگ میں کود پڑنا، دشمن پر پلٹ کروار کرنا، یہ سب آپ کے فن کے کمال تھے۔

اس طرح رسولِ پاک صلی اللہ کے حواری کی تربیت ہوئی. جس کے نتیجہ میں آپ ایک بہادر، ذہین، اور قابلِ فخر نوجوان تھے. اپنے گزرے ہوے ایام کو یاد کرتے ہوے فرماتے کہ مجھ پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ میں اپنے ہم عمر ساتھیوں میں سے کسی اپنے مد مقابل کو شکست دے دیتا تو مجھے میری ماں اپنے سینے سے چمٹا لیتیں تھی اور بسا اوقات یہی ماں میرے لئے ایک غضبناک شیرنی بن جاتی تھیں جب ان کو یہ خبر ملتی کہ آج فلاں شخص نے زبیر کو اکھاڑے میں پچھاڑ دیا اور پھر ڈنڈے سے میری خبر لی جاتی تھی.

قبولِ اسلام.

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زبیر رضی اللہ عنہ آٹھ سال کی عمر میں اسلام لے آے تھے. جبکہ بعض راویوں کا کہنا ہے کہ سولہ سال کی عمر میں ایمان لاے. اس طور سے آپ پانچویں یا چوتھے اسلام لانے والے صحابی ہیں۔

حضرت زبیر اپنی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کے یہاں آتے جاتے تھے وہاں اپنے ماموزاد بھائی علی رضی اللہ عنہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی؛ دونوں تقریباً ہم عمر تھے. ایک روز علی کو نماز پڑھتے دیکھا تو تعجب ہوا، حضرت علی سے اس نئے طریقہ کے بارے میں استفسار کیا. اسی دن ابوبکر صدیق سے ملاقات ہوئی انہوں نے مکمل طور پر اسلام کا تعارف پیش کیا. محمد صلی اللہ علیہ کی نئی تحریک کی خوبیاں بیان کیں. بہر حال ابوبکر کے ساتھ رات کے پہر میں رسول اللہ سے ملاقات کرنے کا وعدہ ہوا. جب رات کا وقت ہوا اور مکہ کی گلیوں میں سناٹا چھا گیا اس وقت آپ ابوبکر کے ساتھ رات میں رسول اللہ سے ملے آپ صلی اللہ علیہ نے زبیر کا پرتپاک استقبال کیا اپنے پہلو میں بٹھایا اور کلمہ پڑھا کر اپنے جانثاروں میں شامل کر لیا. زبیر کا ایمان پختہ اور سچا تھا. جس خودداری اور جرأت پر آپکی نشو ونما ہوئی تھی اسی جرأت کے ساتھ آپ نے اسلام قبول کیا. ایسے جرأتمند اور بہادر شخص کے لئے اپنے ایمان کو پردۂ راز میں رکھنا بڑا مشکل تھا کیونکہ بزدلی اور اپنے مقابل سے دبنا آپ نے کبھی زندگی میں سیکھا نہیں تھا دوسری جانب قبولِ اسلام کا اعلان کرنا اپنی جان کو جوکھم میں ڈالنا تھا. لیکن اس سب کی پرواہ کئے بغیر آپنے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا. جب آپ کے چچا نوفل کو پتہ چلا تو وہ بڑے خفا ہوے اور انکو اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کے لئے زور ڈالا لیکن زبیر کے ٹھوس ایمان کے سامنے کوئی ان کے اصرار کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا. نوفل اپنے غضب کی آگ جلنے لگا، پھر کیا تھا زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک چٹائی میں لپیٹتا اور نیچے سے دھواں ناک میں چڑھاتا جب اس کو احساس ہو جاتا کہ سانس گھٹا جا رہا ہے اس وقت کہتا زبیر اب بھی اپنے دین کا انکار کر دے تجھے اس مصیبت سے نجات مل سکتی ہے لیکن زبیر کا ایک

ہی جواب ہوتا۔ایمان میں داخل ہوجانے کے بعد کفر کی جانب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے. اوراس راہ میں میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں.

زبیر کا چچا جب انکو کفر کی جانب لانے سے مایوس ہوگیا. تماتر کاوشوں اور حیلوں کے بعد بھی وہ زبیر کو کفر کی جولان گاہ میں واپس نہ لا سکا تو. اب مجبور ہوکر زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا زبیر اس ظلم وستم کی بھٹی سے اپنے ایمان کو صحیح سلامت لے کر نکل گئے.

ہجرتِ مدینہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مدینہ کی جانب ھجرت کرنے کا حکم فرمایا. اس وقت زبیر رضی اللہ بھی مکہ ہی میں تھے آپ نے بھی سلامتیٔ ایمان کی خاطر مدینہ کی جانب رختِ سفر باندھا. قباء کے پاس مقامِ عصبہ میں پڑاؤ ڈالا اور پھر مدینے پہنچے. یہاں سے آپ کا مدنی دور شروع ہوتا ہے آپ نے کفار کے تئیں اپنی تلوار کو میان سے باہر نکالا اور تحریکِ اسلامی کے بہادر سپاہی بن کر ابھرے. آپ ہر موقع پر شمشیرِ برق دام بن کر کفار پر ٹوٹے اور رسول اللہ کی حفاظت فرمائی. آپ کی جنگی مہمات کو دیکھ کر بطورِ انعام کے زمین کا کوئی حصہ بھی دیا گیا. لیکن آپ کی نظر دنیا کے مال ومتاع پر نہی تھی بلکہ جذبۂ شوقِ شہادت آپ کے سینہ میں موجزن تھا آپ کے ذہن ودماغ میں کفارِ مکہ کے ان درد بھرے مظالم کی تصویر جو انہوں نے مجبور ولاچار مسلمانوں کے ناتواں جسم پر نقش کی تھی ان کے ذہن و دماغ میں تازہ تھی. مکے کے کفار نے صحابۂ کرام کے خون پسینہ کی کمائی کو ان لوگوں نے جائز سمجھ لیا تھا. اس لئے ہر مسلمان کے لئے کفار سے اعلانِ جہاد ایک بہت بڑی نعمت تھی. مہاجرین بس کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ خدا کا حکم ملے اور ان علمبردارانِ کفر سے خدا کی زمین کو صاف کیا جاے. بالآخر بدر کا میدانِ کارزار گرم ہوا. اب جنگِ بدر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے کارناموں کی داستان سنئے.

جنگ بدر:

عاتکہ بنتِ عبدالمطلب جو زبیر رضی اللہ عنہ کی خالہ جان ہیں انہوں نے ایک ایسا خواب دیکھا جس نے ان کے ہوش اڑا دئے. اپنے بھائی عباس ابن عبدالمطلب کو بلایا اور عرض کیا برادرِ عزیز آپ کی قوم پر کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے. گزشتہ شب میں نے ایک خواب دیکھا ہے جو کسی بڑے حادثہ کا پیش خیمہ معلوم پڑتا ہے. میں اس خواب کو بیان کرتی ہوں لیکن از راہ کرم اس کو کہیں نقل مت کرنا. بیان تو کرو. عباس نے کہا!

میں نے دیکھا کہ ایک سوار اپنے اونٹ پر سوار ہوکر آتا ہے اور مقامِ ابطح پر کھڑا ہوکر ایک ندا لگاتا ہے کہ اے قریش تین دن کا موقع ہے تم اپنی موت کا انتظام کرلو.

پھر میں دیکھتی ہوں کہ بہت سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہوگئے پھر وہ سب کو لیکر مسجد میں داخل ہوتا ہے لوگ مسجد میں داخل ہو ہی رہے ہیں کہ وہ وہاں سے نکل کر جبلِ ابوقبیس پر جا کر کھڑا ہوجاتا ہے اور ایک پتھر اٹھا کر اس کو نیچے پھینکتا ہے نیچے پہنچتے پہنچتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اس کے ٹکڑوں میں سے ایک ایک ٹکڑا مکے کے ہر گھر میں پہنچتا ہے.

عباس نے کہا خدا کی قسم واقعی یہ خواب کسی المناک حادثہ کا عندیہ دیتا ہے لہذا اس خواب کا کسی سے ذکر نہ کرنا. لیکن یہ خواب پردۂ خفا میں نہ رہ سکا بلکہ زبان زد خاص وعام ہوگیا قریش کی مجلسوں میں اس کا ذکر ہونے لگا یہاں تک کہ ابوجہل کو بھی اس کی بھنک لگ گئی. ابوجہل نے پوری قوم کو لتاڑتے ہوں کہا! اے لوگو! کیا اتنا کافی نہیں تھا کہ تمہارے معاشرہ کے لوگ نبوت کا دعویٰ کررہے ہیں کہ عورتیں بھی اب نبوت کا دعویٰ کرنے چل پڑی ہیں عاتکہ کا کہنا

ہے کہ تین دن میں یہ مصیبت آنے والی ہے چلو ہم تین دن انتظار کر لیتے ہیں اگر یہ خاتون اپنی بات میں سچی ہے تو یہ ضرور ہو کر رہے گا ورنہ عرب کے جھوٹوں کی تاریخ میں سرفہرست انہی کا نام لکھا جائے گا ابھی تین دن بھی نہ گزرے تھے کہ ضمضم غفاری چیختا چلاتا اپنا گریباں چاک کرتا ہوا مکہ میں داخل ہوا. اے قریش اپنے اس تجارتی قافلہ کی خبر لو جواب محمد کے ساتھیوں کے رحم وکرم پر ہے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم اب کچھ نہ کر سکو گے لوگو یہ تو بڑا بھاری نقصان ہے. ضمضم غفاری کی خبر نے قریش کے ہوش اڑا دئے جلد از جلد ایک فوج تیار کر کے میدانِ بدر کی جانب نکل پڑے قریش کی فوج بھاری بھرکم ہتھیاروں سے لیس تھی فوج کا مقابلہ چند نہتے مسلمانوں سے ہوا حضرتِ زبیر کی تلوار کفار پر بجلی بن کر گری اور نظام کفر کو تہس نہس کر ڈالا، کفار کا ایک سرغنہ عبید بن سعید بن العاص تھا اس کو طاقت وقوت پر بڑا ناز تھا. اس نے اپنے آپ کو جنگی زرہ میں چھپا رکھا تھا صرف آنکھیں چمک رہی تھیں حضرت زبیر نے تاک کر ایسا تیر مارا جو آنکھوں کے راستہ سر کے پار ہو گیا اور چند ہی لمحوں میں وہ زمین پر ڈھیر تھا آپ نے جنگِ بدر کے موقع سے زرد رنگ کا عمامہ لپیٹ رکھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فرشتے زبیر کی شکل میں بدر کے موقع سے نازل ہوے تھے. جنگِ بدر کا خاتمہ قریش کی شرمناک اور دردناک شکست پر ہوا اپنی طاقت وقوت پر ناز کرنے والے چند بے سروسامان و بے بس مسلمانوں سے پٹ کر واپس ہوے تو احساس شکست نے ان کو مزید بے دم و بے خود کر دیا تھا.

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے بعد دس آدمیوں کو ایک جماعت کی جاسوسی کے لئے بھیجا ان میں خبیب بن عدی بھی تھے یہ عابد و زاہد متقی انسان تھے. اس جماعت کی آمد کا احساس بنو ھذیل کی ایک شاخ بنولحیان کو ہو گیا ان لوگوں نے تعاقب کیا اور ایک مقام پر ان سب کو گرفتار کر لیا آٹھ کو شہید کر دیا اور دو کو گرفتار کر کے قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا گرفتار ہونے والوں میں خبیب بن عدی بھی تھے قریش نے انکو بے دردانہ طور پر پھانسی دے کر نعش کو درخت پر لٹکا رہنے دیا تا کہ اس اللہ کے برگزیدہ بندے کی نعش کو دیکھ کر جنگِ بدر میں لگے زخموں کو کچھ مندمل کر سکیں.

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی آپ نے فرمایا کون ہے جو قتش کے درمیان سے خبیب کے لاشے کو لیکر آے گا اور جو لاے گا میں اس کے لئے اللہ سے دعاء کروں گا کہ رب تبارک وتعالیٰ اس کو بہترین جزا عطاء فرمائے. حضرتِ زبیر کھڑے ہوئے اور عرض کیا اللہ کے نبی اس مشن کے لئے میں تیار ہوں اور میرے رفیق مقداد بن عمر رہیں گے.

حضرت زبیر نے اپنے ساتھی کے ساتھ اس جانب رخ کیا جہاں خبیب بن عدی کی نعش بے گوروکفن ایک درخت سے لٹکی ہوئی تھی قریش کے چالیس افراد اسکی نگہداشت کے لئے تعینات کھڑے تھے انکی ذرا سی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوے خبیب کے لاشے کو درخت سے اتار لیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر مدینہ کا رخ کیا. جیسے ہی قریش کو اس کی بھنک لگی فوراً تعاقب کے لئے چند شہسواروں کو دوڑا دیا. جب یہ لوگ زبیر کے قریب ہوے زبیر نے چلا کر کہا.

سنو! مجھے زبیر کہتے ہیں. میرے ساتھ دو شیر اور ہیں لہذا تم لوگ مقابلہ کے لیئے تیار ہو جاؤ اب دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کر و یا تو مردانہ وار آگے بڑھو اور ہمارا زور دیکھو اور اگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ کیونکہ جب تک ہمارے جسم میں جان ہے دنیا کی کوئی طاقت ہم سے خبیب کا جثہ نہیں چھین سکتی. قریش کے بہادر یہ جرأت مندانہ کلام سن کر واپس ہو گئے زبیر و مقداد نے خبیب کی نعش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا. اتنے میں جبریل حاضر ہوے اور عرض کیا اللہ کے نبی آپ کے ان جانبازوں پر فرشتے بھی ناز کر رہے ہیں.

جنگ احد:

جنگِ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اصحاب سے چوک ہوئی جن کو ایک پہاڑ پر تعینات کیا تھا کہ دشمن عقب سے حملہ آور نہ ہو. لیکن جب شروع میں مسلمانوں کے دیوانہ بار حملوں کی تاب نہ لاکر مشرکینِ مکہ میدان احد چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوے تو ان اصحاب نے وہ مورچہ خالی چھوڑ دیا جس سے مشرکین کو پلٹ وار کرنے کا موقع مل گیا. کفار کی جانب سے یہ ایسا سخت وار تھا کہ مسلمانوں کی صفیں تتر بتر ہوگئیں. ایک بڑی تعداد شہید ہوئی. حضرت زبیر نے اس جنگ میں اپنی تلوار کے ایسے جوہر دکھاے کہ شکست کو فتح میں بدل دیا. آپ نے اپنی آنکھوں سے اپنے ماموں حمزہ ابنِ عبدالمطلب کو شہید ہوتے ہوے دیکھا لیکن پاے ثبات میں کمی نہیں آئی. اس اندوہناک حادثے کی کیفیت بیان فرماتے کہ میں نے ہندہ اور اس کی خادمات کو دیکھا کہ وہ اپنے پہنچے سمیٹے میدان سے بھاگی جارہیں ہیں اگر میں چاہتا تو میرے لئے ان کو پکڑنا. کہ ایک مسلم بہادر کی سپاہی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی عورت کو اپنا شکار بنائے مشکل نہ تھا مگر کیونکہ ہندہ ہی میرے ماموں جان کی قاتل تھی. لیکن میری خودداری اور اسلامی تعلیمات کے تقاضے نے مجھے حملہ سے روک دیا. بہرحال قریش نے میدان چھوڑ کر مکہ کی راہ لی ادھر رسولِ پاک اور آپ کے اصحاب بہت زخمی ہو چکے تھے اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں کفارِ مکہ پھر سے حملہ آور نہ ہوجائیں. لہذا ان کے حوصلے پست کرنے اور کفار پر اس بات کے اظہار کے لئے کہ ابھی ہماری قوت نے جواب نہیں دیا ہے یہ ندا لگائی کہ کون ہے جو ان کفار کا تعاقب کرے گا حضرتِ ابوبکر اور حضرت زبیر سترہ اجلۂ صحابہ کے ساتھ اس مہم کے لئے تیار ہوگئے اور مشرکین کے تعاقب میں نکل پڑے. قریش کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے مکہ کی جانب تیز قدم بڑھاے اور پھر سے پلٹ وار کا ارادہ ترک کر دیا اس موقع سے قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل ہوئی. آل عمران (۱۷۲-۱۷۴)

خوشا قسمت تھا یہ حواری جس نے ایسے نازک وقت میں رسول اللہ کی مدد کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا اور اپنے آپ کو خدا کی بیش بہا نعمتوں اور اس کے فضل وکرم کا مستحق بنایا.

جنگ خندق :

جنگِ خندق کے دن رسول اللہ نے فرمایا کون ہے جو بنوقریظہ کی خبر لاے. حضرتِ زبیر جو رسول اللہ کی خدمت کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے تھے فوراً لبیک کہا اور گھوڑے پر سوار ہوکر بنی قریظہ کی جانب نکل پڑے اللہ کے رسول نے پھر دوبارہ ارشاد فرمایا ہر نبی کا حواری ہوتا ہے اور میرے حواری زبیر بن العوام ہیں.

جنگِ خندق میں آپ ان مجاہدین کے ساتھ تھے جو خندق پر کھڑے ہوے مشرکین کی در اندازی سے مدینہ کی حفاظت فرما رہے تھے.

آپ کی والدہ محترمہ صفیہ بنتِ عبدالمطلب مدینہ میں یہود سے مسلمان خواتین کی حفاظت فرماتے ہوے وہ بہادرانہ کارنامے انجام دے رہیں تھیں جو مردوں کے شایانِ شان ہوتے ہیں. ہم حضرتِ صفیہ کی زبانی ہی جنگِ خندق کے موقع سے مدینہ کے اندرونی حالات کی کہانی سنتے ہیں. آپ فرماتی ہیں.

میں رسول اللہ کی ازواج کے ساتھ حسان بن ثابت انصاری کے قلعہ میں موجود تھی کہ اچانک میری نگاہ ایک یہودی پر پڑی جو ہتھیار بند ہوکر قلعہ کے اردگرد گھوم رہا تھا. مجھے یہ اندیشہ ستانے لگا کہ ضرور یہ دشمن کے لئے ہماری جاسوسی کررہا ہے. مشکل یہ تھی کہ حضرتِ حسان کے علاوہ قلعہ میں کوئی مرد موجود نہیں تھا اور حسان صرف شاعر تھے وہ رزم گاہ کی سخت کوشیوں سے دور رہنے والے تھے. میری ہمت نہ پڑی کہ میں ان سے اس یہودی کے قتل کا مطالبہ

کروں میں نے اپنے دل کو بڑا کیا اور ایک مضبوط ڈنڈا لے کر پوشیدہ طور پر قلعہ سے باہر نکلی اور گھات میں بیٹھ گئی جیسے ہی اس کا چہرہ میری جانب ہوا ایسے زور سے اس کے ڈنڈا مارا کہ وہ ایک ہی وار میں زمین پر ڈھیر تھا پھر مسلسل دو تین وار نے اسے اس دنیا کی لذتوں سے محروم کر دیا. جب صحابہ کرام میں اس واقعہ کا چرچا ہوا تو لوگوں نے کہا اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ یہ وہ صفیہ ہے جس کے بطن سے حواررسول زبیر بن العوام جیسے مجاہد نے جنم لیا ہے۔

حضرت زبیر جنگ خندق کے بعد مدینہ کو یہودیوں کے ناپاک وجود سے صاف کرنے میں شریک رہے. غزوۂ خیبر اور پھر. اس کے بعد فتح مکہ کے دن بھی موجود رہے. فتح مکہ کے بعد قبیلۂ ھوازن کو پتہ چلا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا ہے اور اب ان کا سیدھا رخ ہماری جانب ہوگا لہذا بہتر یہ ہیکہ قبل اس کے کہ وہ جنگ کی ابتدا کریں ہمیں پیش قدمی کر دینی چاہئے. لہذا پورا قبیلہ جمع ہوا اور اتفاقِ رائے کے ساتھ جنگ کا فیصلہ ہوگیا. مالک بن عوف النغری پورے قبیلہ کے بچوں خواتین اور مال ومنال لے کر میدان میں اترا تا کہ جنگ فیصلہ کن ہو. اس دن زبیر کی بھی ایک شان تھی اپنے نیزے کو کاندھے پر رکھے سر پر لال رومال باندھے میدان میں سرپٹ گھوڑا دوڑاتے پھر رہے تھے. جس طرف جاتے میدان چھٹ جاتا. یہاں تک کہ ایک مشرک چلا کر بولا لوگو دیکھتے ہو یہ کون ہے یہ زبیر بن العوام ہے، میں لات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج یہ تم پر بہت بھاری پڑے گا لہذا چوکنا رہنا. اس جنگ میں زبیر نے اپنی جانبازی کے جوہر دکھائے اور چاہا کہ جامِ شہادت نوش کر لوں لیکن ابھی پیمانہ دور تھا. کفار کی صفوں کے پرخچے اڑا دیئے جنگ کا اختتام مسلمانوں کی شاندار فتح کے ساتھ ہوا. دورانِ جنگ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا سکینہ نازل فرمایا ان کے قدموں کو جمایا اور فتح سے شادکام فرمایا.

مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد قبیلۂ ھوازن کے سردار مالک بن عوف نے ایک مقام پر اپنے ہمنواؤں کو جمع کرنا شروع کیا تا کہ جب مسلمان مالِ غنیمت جمع کر کے واپس ہوں تو پلٹ کر حملہ کر دیا جاے. حضرت زبیر کو اس سازش کا علم ہوگیا آپ نے چند مجاہدین کو لے کر اس جانب رخ کیا کفار نے پلٹ کر دیکھا تو تلواروں کی برق ہائے بے تاب ان کے سروں پر چمک رہی ہے. زبیر نے اس غلاظت کو بھی مسلمان مجاہدین کے راستے سے صاف کر کے پرامن بنا دیا. کیا جنگِ حنین زبیر کے شوقِ جہاد کی آخری تصویر ہے! جی نہیں. ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں.

جنگ یرموک.

جنگِ یرموک حضرتِ خالد بن ولید کی قیادت میں رومیوں سے سن تیرہ ہجری میں لڑی گئی. اس جنگ میں رومیوں نے اپنا سب کچھ جھونک دیا تھا ادھر خالد بن ولید نے بھی اس شان سے اس جنگ کو لڑا کہ اب تک عرب کی تاریخ میں ایسی جنگ نہیں لڑی گئی تھی. حضرت خالد نے چھتیس علم تیار کئے اور فوج سے مخاطب ہو کر فرمایا! لوگو! سنو تمہارا دشمن بڑی تعداد کے ساتھ باغیانہ تیور میں تمہارے سامنے لنگر انداز ہوا ہے میں نے آج جتنے علم بنائے ہیں عرب کی تاریخ میں کبھی اتنے علم نہیں تیار کئے گئے. حضرت خالد نے فوج کے قلب کا امیر ابوعبیدہ کو اور میمنہ پر عمرو بن العاص شرحبیل بن حسنہ اور میسرہ پر یزید بن ابی سفیان کو امیر بنایا اور جنگ کے ان تینوں سروں کے لئے ایک امدادی دستہ اور اس کا ایک امیر بنایا یہ دستہ ایک ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا. امیرِ دستہ کے لئے لازم تھا کہ وہ قلب میمنہ اور میسرہ کے امیر سے مشورہ کرتا رہے اور جس سمت مسلمان فوج کمزور پڑے اس سمت اس کی مدد کرے. اور پورے لشکر کے

لئے ایک خطیب بنایا جس کا کام یہ تھا کہ وہ افسانوی طرز پر اسلامی واقعات وقصص کو بیان کرے جو مسلمان مجاہدین کے لئے مہمیز کا کام کرے. یہ ذمہ داری ابوسفیان بن حرب نے بہت اچھے انداز سے نبھائی.

ابوسفیان پوری فوج میں گشت لگا رہے تھے ہر دستہ کے پاس کچھ لمحہ کے لئے ٹھہرتے اور عرض کرتے. خدا کی قسم. خدا کی قسم تم عرب کا بہترین توشہ اور اسلام کے جانثار ہو اور تمہارا مدِ مقابل روم کا توشہ اور شرک کا ہمنوا ہے، لہذا آج کا دن تو خدا کی قدرت کو دکھانے کا ہے . اے پروردگار آج تو اپنے بندوں پر اپنی مدد کا ظہور فرما۔

قارئین! آپ نے دیکھا کہ اس پورے منظر میں حضرتِ زبیر کا کوئی ذکر نہی آیا حالانکہ زبیر کا نام ان عظیم قائدین میں ہے جنہوں نے جنگ یرموک کی فتح میں بڑا کردار نبھایا. آپ ان معاون دستوں میں سے ایک دستے کے امیر تھے جو تینوں سروں کی مدد کے لئے بنائے گئے تھے. میدانِ یرموک کی سرزمین پر آپ کے مبارک خون کے قطرے گرے ہیں یرموک کا میدان اس بات کا گواہ ہے. حضرت زبیر نے دشمنوں کے بہادر دستے پر حملہ کیا اور ان کے جنگی شیرازہ کو منتشر کر دیا بے شمار کفار آپ کی تلوار سے واصلِ جہنم ہوے. آپ کو بھی گہرے زخم لگے آیئے ہم ان کے فرزند عروہ ابن زبیر کی زبانی سنتے ہیں کہ ان کے والد کا جنگِ یرموک میں بہادرانہ رول کون سا تھا. عروہ کہتے ہیں. اصحابِ رسول نے جنگِ یرموک میں کہا زبیر اگر تم کفار پر حملہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں حضرتِ زبیر بسم اللہ پڑھ کفار پر ٹوٹ پڑے آپ کے کاندھے پر دو گہرے زخم تھے ان میں سے ایک جنگِ بدر کا تھا اور ایک جنگِ یرموک کا. عروہ کہتے ہیں میں اور میرا بھائی عبداللہ جب ہم کم سن تھے تو والد کے ان زخموں کے سوراخ میں انگلی ڈال کر خوب کھیلا کرتے تھے . اندازہ کیجئے کہ یہ زخم کتنے گہرے ہوں گے کہ بچوں کے کھیل کا سامان بن گئے زبیر کی بہادری کا چرچہ دربارِ عمر میں ہوا تو حضرت عمر نے کہا. زبیر اسلام کے رکنوں میں سے ایک مضبوط رکن ہیں. یہ ہے اس مجاہد کی بہادری کا چرچہ جس کو شوقِ شہادت نے ایک پل سکون نہ لینے دیا وہ اس کی تلاش میں مسلسل میدان جہاد میں شریک ہوتا رہا اس کے شوق کی انتہا صرف میدان یرموک تک ہی نہیں ہوئی بلکہ مصر میں قلعہ بابلیون کے دروازے پر بھی تابندہ ہے.

قلعہ بابلیون:

حضرتِ عمرو بن العاص نے مصر کا رخ کیا تا کہ وہاں سے بت پرستی کی جڑیں اکھاڑ کر اسلام کا بیج بوئیں. مشرکین نے روم میں مختلف معرکوں میں شکستِ فاش کھا کر مصر کو اپنا مرکز بنانا شروع کیا. ایک زبردست مقابلہ مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان مقامِ غرما میں ہو چکا تھا اسی طرح ایک مقابلہ ام دنین نامی جگہ پر ہوا ان سب میں مسلمانوں نے کفار کے چھکے چھڑا دئے تھے ان بڑے معرکوں کے بعد عمرو بن العاص نے اپنی فوج کا جائزہ لیا تو اب موجودہ فوج اگلے مقابلے کے لئے ناکافی تھی لہذا حضرت عمر سے مدد کے لئے پیغام بھیجا حضرت عمر نے زبیر بن العوام کی قیادت میں بارہ ہزار فوج مصر کے لئے روانہ کی تا کہ ایک اور عظیم فتح مسلمان رقم کریں. اس فوج میں اجلۂ صحابہ موجود تھے مثلاً مقداد ابن الاسود. عبادہ ابن صامت. مسلمہ ابن مخلد. خارجہ ابن خزامہ. ساتھ ہی ایک پیغام عمرو بن العاص کے لئے لکھا، میں نے ایسی فوج کو تمہاری مدد کے لئے بھیجا ہے جس کا ایک فرد ہزار کے برابر ہے. حضرت زبیر ایسے وقت میں عمرو بن الواص سے ملے کہ مسلمان فوج قلعہ بابلیون کا محاصرہ کئے ہوے تھی. یہ قلعہ مصر کے مضبوط ترین قلعون میں شمار ہوتا تھا. اپنی کشادگی اور عالی شان برجوں سے پہچانا جاتا تھا. پوری رومی طاقت نے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا. مسلم فوج میں شوقِ

شہادت کا ایک جذبہ انگڑائی لے رہا تھا جس کے سامنے تمام مضبوط قلعوں کی فصیلیں بھی ہیچ تھیں. قلعہ کا محاصرہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو فتح کی مکمل امید ہو چلی تھی لیکن حصار لمبا ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ سات مہینے گزر گئے حضرت زبیر نے بھانپ لیا کہ فوج کا جذبہ ٹھنڈا پڑ رہا ہے اور اب زیادہ انتظار نہیں کیا جا سکتا ورنہ اندیشہ ہیکہ پوری فوج مایوس نہ ہو جاے.

حضرت زبیر نے مسلم قائدین کے ساتھ ایک میٹنگ کی اور پوری صورتِ حال سے آگاہ کیا. اور ایک ایسی بات فرمائی جو تاریخ کے باب میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے. فرمایا..

میں اپنے آپ کو خدا کے لئے قربان کرتا ہوں ممکن ہے اللہ تعالیٰ میری اس قربانی کے صلہ میں مسلمانوں کو فتح نصیب کرے اور جنگ کا ایک ایسا خطہ پیش کیا جس سے بعض لوگ متفق تھے اور بعض لوگ مخالف تھے لیکن یہ عظیم مجاہد اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور مجلس سے اٹھ کر چلا گیا. اور اپنے چند جانبازوں کو تیاری کا حکم دیا. قلعہ کی ایک جانب کا علاقہ سوق الحمام کہلاتا تھا. اہلِ روم کو یہ امید نہیں تھی کہ اس جانب سے بھی حملہ ہو سکتا ہے. آپ رضی اللہ عنہ اسی سمت سے قلعہ کی دیوار پر سیڑھی لگا کر پوری چابک دستی کے سے اپنے کچھ بہادر جوانوں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گئے. آپ اور آپ کے ساتھیوں نے داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جس کی ہیبت سے دشمن حواس باختہ ہو گیا بالآخر مسلم فوج کے آگے ہتھیار ڈال دئے اور اس طرح زبیر بن العوام کے حوصلہ کے آگے سات مہینہ کے حصار کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا مزید اس فتح سے مصر کے اندر رومیوں کا سارا دبدبہ ختم ہو گیا اور سرزمینِ مصر نے رومیوں کے ظالمانہ نظام اور اس کے سامراجی پنجہ سے نجات پائی اور اسلام کی جولان گاہ بن گیا جہاں پھر حق کا آواز بلند ہونے لگا.

تو یہ تھے حضرتِ زبیر رضی اللہ عنہ جنکے بلند حوصلوں اور بہادرانہ کارناموں کی داستان پڑھ رہے تھے ان کی بہادری اور فہم وفراست کے جلوے قلعۂ بابلیون کی فتح پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ آپ مسلمانوں کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر تھے آپ سے رائے لی جاتی تھی آپ صاحب الرائے تھے. اس فتح کے بعد آپ مصر سے مدینہ لوٹ آے اور یہیں آپ نے اقامت اختیار کی. کلام اللہ سے آپ کو بے حد شغف تھا. جو کچھ بھی اللہ نے آپ کو دیا تھا اس سے خوب سخاوت فرماتے ہر کس و ناکس آپ کے یہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور پاتا تھا ایک روز آپ شہرِ مدینہ میں بیٹھے ہوے تھے ایک صاحب نے آپ کے جسمِ طاہر کو دیکھا کہ اس پر بے شمار سوراخ اور نشانات ہیں تو انہوں نے بے ساختہ کچھ اشعار گنگناے جن کا مفہوم یہ ہے.

میں کچھ لمحوں کے لئے زبیر کی رفاقت میں رہا تو میں نے ان کے جسم کو اس طرح پایا جیسے تلوار سے اس کے ٹکڑے کئے گئے ہوں اور نیزوں سے اس کو چھیدا گیا ہو اور اس طرح کے گڑھے دیکھے جیسے بہتے ہوے چشموں کے سوراخ ہوتے ہیں.

میں نے زبیر سے کہا بخدا میں نے ایسا کوئی جسم نہیں دیکھا جیسا زبیر تمہارا ہے زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا میرے جسم کو جو کچھ بھی ملا ہے سب خدا کی راہ میں ملا ہے۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: دعوتِ اسلام اقوام عالم اور برادران وطن کے درمیان

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

صفحات: ۳۴۸ قیمت: ۱۶۰

ناشر: الفاروق پبلیکشنز، کڑپہ، اے پی، انڈیا۔

ملنے کے پتے: دارالکتاب، دکن فاؤنڈری (اسٹیٹ بینک کے سامنے)، حیدر آباد (تلنگانہ اسٹیٹ)۔ ھدی بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد۔ دکن ٹریڈرس، چار مینار، حیدر آباد۔ ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان، چار مینار، حیدرآباد۔

جب لکھنے پڑھنے کا شعور ہوا تو جن اہل قلم کی تحریروں نے قوت فکر و تخیل کو جلا بخشی، شعور و آگہی سے روشناس کیا، قلم کی دلپذیری اور تحریر کی کشش سے آشنا کیا ان میں ایک نام پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب کا ہے، ادھر ۲۰۱۱ء سے عرب بہاریہ کی منصوبہ بند ناکامی، پھر اخوان پر شب خون مارنے کے بعد مظالم کی نئی داستان کی ابتدا، سعودیہ کی اغیار دوستی اور پھر ۲۰۱۴ء میں مفکر اسلام کانفرنس کے بعد سے ان سے تعلق میں اضافہ ہوتا گیا، میں عالم شوق میں ان کی تحریروں کا انتظار کرنے والوں میں ہوں، یوں تو ان کی کوئی تحریر مقصدیت سے خالی نہیں ہوتی، ان کی اکثر تحریریں محض تحریر نہیں، بلکہ بسا اوقات وہ خون دل سے لکھی جاتی ہیں، اور کبھی خلوص کی روشنائی صفحات پر بکھیری جاتی ہے، کبھی قصۂ درد سنایا جاتا ہے، کبھی داستان الم کا بوجھ قلم پر ڈال کر جی ہلکا کیا جاتا ہے، ان کی تحریریں نئے فکری زاویے عطا کرتی ہیں، غور وفکر کی نئی راہیں کھولتی ہیں، قرآنی انداز فکر کو فروغ دیتی ہیں، ان میں زبان و بیان کی چاشنی تو ہوتی ہی ہے لیکن فکر و تڑپ کا پہلو انھیں ایک مجلس میں پڑھ جانے پر مجبور کرتا ہے، ان کی تحریروں میں توازن ہوتا ہے، لفظوں کا حسن انتخاب ہوتا ہے، صریح نقد ہوتا ہے، کہیں کہیں تلخ نوائی بھی ہو جاتی ہے، مگر اس تلخ نوائی کو زیادہ سے زیادہ پیمانۂ درد کے چھلک جانے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے، ورنہ عام طور پر ان کا قلم حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتا، شہر خموشاں کے سے سکوت اور مسلسل جمود کے باوجود وہ ناصحانہ اور دانشمندانہ رنگ میں ہی نظر آتا ہے، مسلسل دعوت فکر و نظر کے بعد اگر کبھی شکوہ و شکایت نوک قلم پر آئے تو اس کی بہر حال گنجائش ہے، اس پر اعتراض و اظہار ناراضگی کے بجائے اس کو دعوت احتساب سمجھ کر اپنا انفرادی و اجتماعی محاسبہ کرنا چاہیے، سچ یہ ہے کہ اس پر چیں بجبیں وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح کی تنقید میں اپنی صورت دیکھنے لگتے ہیں، یحسبون کل صیحة علیھم ..... (منافقون) ''کوئی شور ہو یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر کوئی مصیبت آئی''۔

بہر حال میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا وہ بات تو رہ گئی اور تمہید طویل ہوگئی، لکھنا یہ چاہتا تھا کہ اس قدر تعلق کے باوجود آں محترم کی یہ کتاب راقم کی نظر سے کیسے اوجھل رہی؟ یہ امر واقعی باعث حیرت و استعجاب ہے، یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کتاب کو ہزاروں کی تعداد میں چھپنا چاہیے اور کم از کم ہر مدرسہ کے سالِ آخر کے طلبہ پر اس کا مطالعہ لازمی قرار دینا چاہیے، یہ کتاب قلب و دماغ کو جھنجوڑتی ہے، قوتِ عمل کو مہمیز کرتی ہے، دعوت احتساب دیتی ہے، امت مسلمہ کو اپنا فرض منصبی اور اپنی ذمہ داری یاد دلاتی ہے۔

اس امت کے سپرد امانت قرآنی کی گئی، رسالت محمدی کا پیغامبر اس کو بنایا گیا، لوگوں کے لیے اس کی تخلیق کی گئی اور اس کو عالمی

حیثیت دی گئی، ارشاد فرمایا گیا تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا (فرقان:۱) ''بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر ''فرقان'' (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) اتاری، تاکہ اللہ کا بندہ (نبی آخر الزماں) ساری دنیا اور سارے طبقات انسانی (اور جنوں کو) خبردار کرے''، اور یہ حکم دیا گیا قل یا ایها الناس إنی رسول الله الیکم جمیعا (اعراف:۱۵۸) ''کہہ دیجئے کہ انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں''، اس کے رسول کی حیثیت عرفی بیان کرتے ہوئے کہا گیا انا ارسلنك بالحق بشیرا ونذیرا (بقرہ:۱۱۹) اور کہیں فرمایا گیا یا ایها النبی انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذیرا، وداعیا إلی الله باذنه سراجا منیرا (الاحزاب:۴۵،۴۶) ''اے نبی ہم نے آپ کو شاہد (گواہ) مبشر (اہل حق کو خوشخبری دینے والا) اور نذیر (لوگوں کو متنبہ کرنے والا) اور سراج منیر (روشن سورج) بنا کر بھیجا ہے''، انھیں ساری دنیا کے لیے رحمت بنایا گیا وما ارسناك إلا رحمة للعالمین (انبیا:۱۰۷) اور بہت واضح انداز میں کہا گیا کہ وما ارسلنك الا کافه للناس بشیرا ونذیرا ولکن اکثر الناس لا یعلمون (سبا:۲۸) ''اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنایا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''، مکہ مکرمہ میں جب ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے تو انھیں جہاد بالقرآن یعنی کار دعوت کو مزید تیز تر کر دینے کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا وجاهدهم به جهادا کبیراً۔

گویا حضور اکرمؐ کی اصل حیثیت داعی کی ہے، داعی کی دعوت کے ذریعہ تمام دروازے کھلے ہیں، دعوت کے ذریعہ اتمام حجت کیے بغیر کسی طرح کا کوئی اقدام درست ہی نہیں، حضور اکرمؐ نے اپنی پوری زندگی اسی دعوت وتبلیغ میں گزاری، آپ کے صحابہ نے یہی فریضہ انجام دیا، اس امت پر یہی ذمہ داری ڈالی گئی، اس دعوت کے ذریعہ ایرانی وافریقی اور بربر سبھی مسلمان ہی نہ ہوئے بلکہ عرب ہو گئے، اسی دعوت نے لوگوں کے فکر ومزاج اور عادات واخلاق تک بدل کر رکھ دیے، مگر افسوس آج اسی فریضۂ دعوت کو کچھ اس طرح پسِ پشت ڈال دیا گیا کہ اس کی ادائیگی کا احساس تک نہ رہا، بلکہ رفتہ رفتہ یہ ذہن سے محو ہوتا گیا اور اس کا تصور بھی ختم ہوتا چلا گیا، آج ملت کے مسائل کے حل پر گفتگو ہر پہلو سے ہوتی ہے مگر دعوت سے اعراض وغفلت کو موضوع نہیں بنایا جاتا، جو فتح ونصرت کی شاہ کلید ہے، جو غلبہ وتسلط کی ابتدا ہے، جو دائمی امن وسکون کا سبب ہے، جو عزت وعظمت اور استحکام کا ذریعہ ہے، جس کے لیے نبی نے وطن چھوڑا، ہجرت کی، لہولہان ہوئے، گالیاں کھائیں، زخم سہے، پتھر کھائے مگر اس دعوت سے باز نہ آئے، میدان جنگ میں اترنا پڑا تو اترے، سب کچھ داؤ پر لگا دینا پڑا تو لگایا مگر خدائے وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا غلغلہ بلند کرتے رہے، آپ کو جو منصب عطا کیا تھا اس کے تقاضوں میں پہلا تقاضا ہی یہ تھا یتلو علیهم آیاته، مگر آج صورت حال یہ ہے کہ اس ضمیر کا مرجع صرف مسلمانوں کو سمجھا جاتا ہے، قرآن پڑھا جاتا ہے، مگر اس کو سمجھا نہیں جاتا، سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو جلالین وبیضاوی پر اکتفا کیا جاتا ہے، قرآن کو سمجھنا ہے تو اس کی تفسیر اساسی سیرت نبوی علی صاحبها الصلوۃ والسلام کی روشنی میں سمجھنا پڑے گا، نبی کا تعامل کیا تھا، کس موقع پر کس مرحلہ میں کون سا حکم آیا، نبی نے کس طرح عمل کیا، مکہ میں کیا ہوا اور کس طرح کے احکامات آئے، مدینہ میں آپ پر کیا گذری اور کیا احکامات دیے گئے، قرآن کو سمجھنا ہے تو صحن کعبہ کو نظر میں رکھنا ہوگا، مکہ کی گلیوں، زمانۂ جاہلیت کے میلے ٹھیلے، سوق عکاظ ذوالمجنہ، اس زمانہ کے موسم حج اور اس کی کیفیت میں جا کر سمجھنا ہوگا، طائف کی گلیوں اور بستان عداس کے واقعہ کے ساتھ ساتھ، ابو طالب کو دیے گئے جواب، شعب ابی طالب، بیعت عقبہ، بیعت رضوان، ہجرت اور دوران ہجرت پیش آئے واقعات پھر بدر واحد وحدیبیہ اور پھر دعوت کے دیگر مراحل کو پیش نظر رکھنا ہوگا، تب کہیں جا کر گتھی سلجھے گی، اور یہ بات سمجھ میں آئے گی ھم کی ضمیر کا مرجع کون ہے، کن حالات میں

قرآن کا کیا تقاضا ہے اور کس طرح اپنا فرض منصبی ادا کرنا ہے، دعوت ہی دین کی اساس کیوں ہے، دعوت کو چھوڑنے والے مدعو کیوں بن جاتے ہیں، راہ عزیمت وقربانی کو اختیار کرنے سے کیوں کترانے لگتے ہیں، دعوت دراصل قربانی چاہتی ہے، فنائیت، ایثار، خدا ترسی، اخلاص اور جذبہ جہاد چاہتی ہے، دعوت اگر نصرت وفتح کی شاہ کلید ہے تو اس کا راستہ بھی بڑا صبر آزما ہے، مگر جو اس راستہ سے گزر گیا وہ غازی بنا، مجدد بنا، اور جس نے پس وپیش کی اس کا اللہ ہی محافظ۔

یہ کتاب ایسے وقت میں وجود میں آئی ہے، جبکہ دعوت کا اصل معنی ومفہوم بھی ذہنوں سے رخصت ہونے لگا، اصلاحی کوششوں کو دعوت وتبلیغ کا نام دیا جانے لگا، لوگ اس کا مطلب صرف یہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کو دینداری کے لیے آمادہ کرنا اور انھیں دین کی طرف بلانا وسمجھانا ہی دعوت وتبلیغ کا اصل مفہوم ہے، علی الاعلان یہ بات کہی جانے لگی کہ ابھی حالات ایسے نہیں کہ اسلام کی دعوت دی جائے، کیا آج کی صورت حال اس وقت سے زیادہ خوفناک و نازک ہے، جس صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآن پاک نے کہا ہے، واذکروا إذ انتم قلیل مستضعفون فی الأرض تخافون أن یتخطفکم الناس (انفال:۲۶) ''اور اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑی تعداد میں تھے، ملک میں دبے کچلے تھے، تمہیں ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں لوگ تمہارا اغوا نہ کرلیں'' سوچنے کی بات ہے کہ ایسی کسمپرسی اور بے کسی کی نازک صورت حال میں بھی دشمنان ایمان وجان کے درمیان نہ صرف نبیؐ کی دعوت جاری تھی بلکہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ علی الاعلان لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں اور قرآن کے ذریعہ حجت قائم کریں۔

آج دعوت اسلامی جیسے اساسی امر کے لیے ہی طرح طرح کی تاویلیں کی جانے لگیں، اس کے تقاضوں سے ہی انحراف کیا جانے لگا، اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے وہ سامنے ہے، ہر طرف ہم اپنی صفائی دینے میں لگے ہیں، امن کی سوغات تقسیم کرنے والے امن کی دہائی دے رہے ہیں، رحم کا مطلب دنیا کو سکھانے والے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں، کاسہ گدائی اٹھانے، دست سوال دراز کرنے اور غیروں کا دست نگر بننے پر تو راضی ہیں مگر کارِ دعوت کے لئے تاویلیں ہیں، وسائل دعوت کو اپنانے سے گریز ہے، پیغام الٰہی کو سنانے اور پہنچانے سے صریح انکار نہیں تو ٹال مٹول اور عملی انکار تو ہے ہی، جسے احتیاط ومصلحت کا خوبصورت پیکر دیا گیا ہے، یہ وبائے عام ہے جس میں ہندوستان سے لے کر مسلم ممالک کے مسلمان اور حرمین کے باشندے سبھی مبتلا ہیں، سب کے سب یہ بھول گئے کہ دعوت امت کے، ملت کے اور انسانیت کے تحفظ کا ذریعہ ہے، دنیوی واخروی کامیابی، قوت وطاقت اور عزت و عظمت کا سرچشمہ ہے، دنیا میں امن واستحکام اور انسانیت کو نفع پہنچانے والے جتنے بھی کام جاری ہیں سب مفید ونفع رساں ہیں، لیکن ان سب میں دعوت سب سے مقدم اور اہم اور بنیادی چیز ہے، یہ نہ صرف ملی تشخص اور شریعت بلکہ پوری انسانیت کے تحفظ و استحکام کا ذریعہ ہے، سارے کام اپنی جگہ درست ومسلم اور مفید مگر دعوت کی نفی اور دعوت سے اعراض گویا قرآن وسیرت کے مطلب اول اور مقصد اصلی سے اعراض ہے، پروفیسر عثمانی کی یہ کتاب ہر صاحب غیرت کو جھنجھوڑتی اور احساس دلاتی ہے، احساس جوابدہی کی تذکیر کرتی ہے، بے لاگ پیام قرآن سناتی ہے، موجودہ پستیوں کے اسباب وعلاج کا نسخہ پیش کرتی ہے، دوررس نتائج اور ان کے لیے تدابیر پیش کرتی ہے، یوں تو ان کی ہر تحریر جذبہ ایمانی سے لبریز یا فکر اسلامی کی علمبردار ہوتی ہے، مگر یہ وہ کتاب ہے جو ان کے اندر ایک زندہ دل دھڑکنے کا پختہ ثبوت فراہم کرتی ہے، ان کی غیرت ایمانی کی جھلکیاں دکھاتی ہے، قرآن وسیرت سے ان کے تعلق، مطالعہ اور ان کی قوت استدلال سے واقف کراتی ہے، بہت ممکن ہے کہ ان کی یہ کتاب ان کے لیے ذخیرہ آخرت اور باعث نجات ثابت ہو، اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے نہ صرف خود ایک ذمہ دار و باشعور اور بیدار مغز مسلمان ہونے کا ثبوت

دیا ہے، بلکہ تمام علماء اہل دین واصحاب مدارس کو بھی احساس ذمہ داری کو محسوس کرنے کی دعوت دی ہے۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب ''اساسِ دعوت'' ہے، جس میں مصنف نے بھرپور دلائل کے ساتھ قرآن وسنت کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دعوت کا درد اور آخرت کا غم ہی سب سے بڑی سنت ہے، دعوت حفاظت کا ذریعہ ہے، دعوت انبیاء علیہم السلام کا اصلی مشن ہے، دعوت رسالت کا مقصد ہے، اور مقصدِ رسالت غلبہ دین ہے، اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا نصب العین پوری انسانیت کو پیغام حق سنانا اور بندگان خدا تک اس کا پیغام پہنچانا ہے۔

دوسرے باب میں مصنف نے ان خطوط کو پیش کیا ہے، جو دعوت اسلام کے لیے آقائے نامدارؐ نے سلاطین وامراء کو ارسال فرمائے تھے، تیسرا باب ''دعوت اسلام اور صحابہ کرام- چند نمونے'' کے عنوان سے ہے، اس باب میں تبلیغ اسلام سے متعلق متعدد صحابہ کرام کی کامیاب وپُر جوش اور نازک حالات میں پُر از حکمت دعوتی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ہے ''دنیا کی قومیں اسلام کے سایے میں'' اس باب میں مصنف نے دعوت اسلام کی تاریخ کا نہایت علمی انداز میں اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، دعوت اسلام کی ابتدا اور مشرکین عرب کا ذکر کرنے کے بعد عیسائیوں کے قبول اسلام اور اس کے اسباب کا تذکرہ کیا ہے، ایران کے مجوسیوں، وسط ایشیا کے باشندوں، افریقہ کے بربروں، تاتاریوں، ترکوں اور مشرقی یورپ کے لوگوں کے قبول اسلام کا تذکرہ کیا ہے، اسپین، چین انڈونیشیا، ملیشیا اور جاپان میں اسلام کی روشنی پھیلنے کا ذکر کیا ہے، خاص بات یہ ہے کہ مصنف صرف سرسری تذکرہ نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسباب وعلل سے بحث کرتے ہیں۔

پانچواں باب وطن عزیز سے متعلق ہے، جس کا عنوان ''ہندوستان میں تبلیغ اسلام کی اولین کوششیں'' ہے، اس باب میں ہندوستان میں اسلام کے پھیلنے کی تاریخ نہایت موثر وپر کشش اسلوب میں بیان کی گئی ہے، قبول اسلام کے متعدد واقعات ذکر کیے گئے ہیں اور پھر ان سے اس باب کے آخر میں جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ ہر دور میں دعوتی کوششوں کے لیے مشعل راہ ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد چھٹا باب انتہائی اہم ہے، ''اسلام کے اسباب کشش اور اس کی روحانی قوت'' کے عنوان سے مصنف نے اسلام کے حسن اور اس کی کشش سے نقاب ہٹائی ہے، اس کے جلووں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے، اس باب کا مقصد داعی کو یہ بتانا ہے کہ وہ جس دین کی دعوت دے گا اس کے وہ خاص پہلو کون سے ہیں جو مدعو کے دامنِ دل کو سب سے پہلے کھینچتے ہیں، جو دشمنان دین و ایمان کو بھی اپنا اسیر بنا لیتے ہیں اور جن کے سبب ایک دنیا حلقہ بگوش اسلام ہوئی ہے، افسوس ہے کہ لوگ یا تو ان اسباب کشش سے واقف نہیں یا پھر اپنی زندگیوں میں انھیں اتارتے اور برتتے نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ امت اپنا سبق بھول گئی، اس امت کا مشن تھا لوگوں کے دلوں میں حق کی طلب کا بیج ڈالنا۔ مگر یہ اس مشن کو فراموش کر بیٹھی یا لوگوں کو بدلنے کی بھول کرنے لگی۔

ساتواں باب ''دعوت اسلام عصر حاضر میں'' ہے، اس عنوان کے تحت مصنف نے انتہائی واضح، مؤثر اور استدلالی انداز میں یہ فیصلہ سنایا ہے کہ ''راستے بند ہیں سب کوچۂ دعوت کے سوا''، جب مسلمان مظلوم ہوں تو ان کے سامنے صرف تین راستے ہوتے ہیں جو شریعت سے مستفاد ہیں، ہجرت، جہاد اور دعوت، ہندوستان جیسے دار العہد میں مسلمانوں کے سامنے واحد راستہ دعوت اسلام کا فریضہ انجام دے کر اپنی شناخت باقی رکھنے کا ہے، یہی وہ کلید ہے جس سے قفل کھلتے ہیں، اسی کے لیے تمام انبیا کی بعثت ہوئی اور یہی سب کا مشن رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ برادران وطن میں اسلام کے تعارف کو لے کر اب تک مسلمان پس وپیش اور کشمکش میں مبتلا رہے ہیں اور رہتے

ہیں، اسی ضمن میں مصنف نے علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے جس کا آخری جملہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے:

''ہمارے سلاطین اور باشاہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی پر قناعت کی اور عیش وآرام اور جاگیر وخراج کی دولت کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیا، علماء نے درس وتدریس اور فتووں کی عزلت نشینی کی زندگی پر کفایت کی، درویشوں اور صوفیوں نے تسبیح وسجادہ کی آرائش پر بس کی اور زندگی کے کاروبار سے اپنے کو الگ کرلیا، نتیجہ یہ ہے کہ امت رہبری اور رہنمائی کے بغیر اپنے حال سے غافل ہوکر رہ گئی، اور امت مسلمہ کی زندگی کی غرض وغایت اس کے سارے طبقوں کی نگاہ سے مخفی ہوگئی'' (کتاب ہذا، ص ۱۵۷)

پھر بڑے درد کے ساتھ مصنف نے آج کی صورت حال پر تعلیق کی ہے:

''دعوت وتبلیغ کا لفظ اب بھی رات دن خواص مسلمان اور علماء کی زبان پر رہتا ہے؛ لیکن اب اس کی وہ وسعت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی، اس کا مفہوم اب سمٹ کر مسلمانوں کو جمع کر کے کچھ باتوں کی تلقین کرنے تک محدود ہوگیا ہے، اب وہ جوئے کم آب ہے جس میں "شهادة على الناس" کے مفہوم کی بے کرانی ختم ہوگئی ہے، وہ صحرائے دعوت جس کے حدود بے ثغور تھے اور جس کی حیثیت بحر ذخار کی تھی اب ایک محدود ذخیرہ آب کی حیثیت میں آ گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام آج ملک اور بیرون ملک کہیں بھی ہدایت کے منصب پر باقی نہیں ہے'' (کتاب ہذا، ص ۱۵۷-۱۵۸)۔

دعوت کی ضرورت اور اس کے اصل مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مصنف نے آگے مولانا حسین احمد مدنیؒ، قاری محمد طیب قاسمیؒ اور مولانا علی میاں ندویؒ کے اقتباسات نقل کیے ہیں، یہ باب دراصل اس کتاب کا مغز ہے، جس میں دعوت کے معنی ومفہوم، اس کی ضرورت واہمیت، اس کے لیے مواخات، رابطہ عامہ، حسن سلوک اور داعیانہ اخلاق پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ دعوت کے لیے مادی وسائل کے استعمال کی شرعی حیثیت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

آٹھواں باب ''دعوت اسلامی کا مستقبل- ایک خواب ایک آرزو'' ہے، جس کا اسلوب تحریر انتہائی پرکشش ہے، جو دعوت کو نجات دہندہ ثابت کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ اس ملک کو اسپین بننے سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ دعوت اسلامی ہے، اس باب میں امت مسلمہ کے خیر امت ہونے کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے اور اس کا فرض منصبی بھی یاد دلایا گیا ہے، دعوتی مراحل کا بھی تذکرہ ہے اور بیسویں واکیسویں صدی میں دعوتی پیش رفت کا مختصر جائزہ بھی، اس باب کے اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ الگ مضمون ہے جس کو بعد میں شامل کتاب کیا گیا ہے، اس لیے یہ باب انتہائی جامع اور کتاب کے بہت سے موضوعات پر محیط ہے، مصنف کے نزدیک دعوت ہی ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل متعین کرے گی، اس لیے مستقبل کا راستہ واضح ہے، لیکن اس راستے پر چلنے کے لیے تیاری کی ضرورت ہے، اور اسی تیاری سے آرزو پیدا ہوتی ہے، مصنف کو اکیسویں صدی میں نمود سحر کی آرزو ہے مگر وہ جانتے ہیں کہ آرزو کو عزم بالجزم کی ضرورت ہے کیوں ''وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں''۔

مصنف نے صرف نظریہ نہیں پیش کیا ہے، صرف واقعات نہیں سنائے ہیں، تاریخ بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے صرف خواب نہیں دیکھا ہے، بلکہ نخل آرزو کو ثمر آور دیکھنے کے لیے دسویں باب میں ''نئی منصوبہ بندی'' کی ضرورت پر گفتگو کی ہے، قرآن وسنت کی اور تاریخ کی روشنی میں وسائل وامکانات اور طریقہ عمل پر گفتگو کی ہے، یہ باب چشم کشا، قابل مطالعہ اور لائق عمل ہے، مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایک طبقہ ''نئی منصوبہ بندی'' کا عنوان پڑھ کر ہی ہتھے سے نہ اکھڑ جائے، مواد کا مطالعہ کیے بغیر اور منصوبہ پر نظر ڈالے بغیر ہی تیر وتفنگ کے ساتھ میدان کارزار میں نہ کود پڑے، کیوں کہ اس کے بعد کا باب ''مدارس کا نصاب تعلیم اور نیا چیلنج'' بھی اسی سے متعلق ہے، تجدید، تبدیلی، تغیر، نیا پلان، نیا منصوبہ، از سر نو غور وفکر یہ سب ایسے ڈراؤنے، بھیانک اور مہیب مفردات ومرکبات

ہیں جن کی حیثیت ایک طبقہ کے لیے کسی آسیب سے کم نہیں، ان الفاظ کے زبان پر آتے ہی اس طبقہ کو اسلام خطرے میں نظر آنے لگتا ہے، علوم شرعیہ کے مفقود ہونے کا خطرہ منڈلانے لگتا ہے اور بے فائدہ مباحثہ وجدال کا لایعنی عمل شروع ہوجاتا ہے، مصنف کے نزدیک مدرسہ کی حیثیت انسانی جسم میں دل اور انسانی معاشرہ میں پاور ہاؤس کی ہے، اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ مدرسہ کو کس قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں، اور اس کا مستقبل کیسا چاہتے ہیں، بحث طویل ہوجائے گی اس لیے مختصرا یہ عرض ہے کہ مصنف کے نزدیک اس ملک میں مسلمانوں کے روشن مستقبل کا انحصار چونکہ وسیع پیمانہ پر دعوت اور اسلام کے صحیح تعارف پر ہے، ان کا یہ نظریہ صحیح اور مبنی برحقیقت بھی ہے، جبکہ اسی مضبوط بنیاد اور وجہ بقاء وعزت امر سے علماء اور اہل دین نے سب سے زیادہ غفلت برتی ہے، مصنف نے اس حقیقت کو بھی واشگاف بیان کیا ہے کہ دعوت لسان قوم میں ہی مؤثر ہوسکتی ہے، چونکہ مدارس کے قیام کا مقصد ہی حفاظت دین اور اشاعت دین ہے تو پھر مدرسہ کو اس کے لیے تیار ہونا پڑے گا، اس کے لیے نصاب تعلیم میں تبدیلی کرنی پڑے گی، ملکی اور علاقائی زبانوں کو شامل کرنا پڑے گا، محض روایات کا تحفظ کرنے والی کتب سے جان چھڑانا پڑے گا، منطق وفلسفہ کو چھوڑ کر تقابل ادیان اور دیگر مذاہب کے عقائد اور ان کے فلسفوں سے واقفیت حاصل کرنی ہوگی، یہ پورا باب انتہائی فکر انگیز ہے اور خونِ دل سے لکھا گیا ہے، اس کو پڑھنا اور عمل میں لانا راقم کے نزدیک انتہائی ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اس ملک میں مسلمانوں نے اگر یہ پیغمبرانہ مشن، جو ان کا فرض منصبی بھی ہے انجام نہیں دیا تو ان کا مستقبل شب دیجور سے زیادہ تاریک ہے۔ نصاب تعلیم کو زمانہ اور زمین کی حقیقی ضرورتوں کے مطابق ہونا چاہیے، دعوت وتبلیغ کا کام مسلمانوں کا فرض منصبی ہے اور اس فرض کو بحسن وخوبی زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ادا کرنے کے لئے ادیان عالم جدید فلسفہ، جدید علوم اور نظریات اور ہندوستانی مذاہب سے واقفیت ازبس ضروری ہے'' (ص ۲۷۶-۲۷۷)

گیارہواں باب ''مغربی دنیا اسلام کے دروازے پر'' ہے، جس میں درحقیقت مغربی تہذیب کی اپنے ہی ہاتھوں خودکشی پر گفتگو کی گئی ہے، اس تہذیب کی انسانیت سوزی کے باعث وہاں مطالعہ اسلام کے بڑھتے رجحان اور قبول اسلام کے واقعات وشواہد اور اہل مغرب کے تاثرات کو ذکر کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ مغرب میں تبدیلیٔ مذہب خاندانی نفرت وتشدد کا سبب نہیں بنتا اس لیے وہاں قبولِ اسلام کا تناسب بھی زیادہ ہے، اسی فضا کو دیکھتے ہوئے مصنف کا ماننا ہے کہ اگر وہاں دعوت اسلام کی مخلصانہ جدوجہد کو تیز کردیا جائے تو مغربی دنیا اسلام کی آغوش میں آسکتی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے ''اختتامیہ'' لکھا ہے، جو خلاصہ کتاب ہے، اس کی آخری سطریں اس اختتامیہ کا بھی خلاصہ ہیں:

''یہ کتاب (دعوت اسلام) بھی بے شعوری کی چٹانوں کو کاٹنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے، یہ چٹانیں اگر کٹ گئیں تو پھر سے "یدخلون فی دین الله افواجا" کا منظر قابل مشاہدہ بن جائے گا، لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے "وماذلك على الله بعزيز" (۳۱۵)

آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ہندوستان میں دعوت کے لیے کچھ اہم اصول بیان کیے گئے ہیں اور پھر کوششوں کو کامیاب کرنے کی کچھ تدابیر ذکر کی گئی ہیں۔

راقم سطور بھی چونکہ قرآن کا طالب علم ہے، مطالعہ قرآن کے دوران اکثر یہ سوال ذہن میں آتا اور پریشان کرتا تھا کہ اگر ملک بھر کے مشرکین نے رب کریم کی عدالت میں یہ عرضی دائر کی کہ ہم تک تیرے دین کی دعوت نہ پہنچی اور ہمیں تیرا پیغام نہ سنایا گیا تو اس سے بچنے کی کیا سبیل ہوگی اور کون بچ سکے گا، یہ کتاب درحقیقت اس ناحیہ سے مزید جھنجھوڑتی ہے، اس کو پڑھتے ہوا یہ سوال مزید منہ پھاڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے، اور کوئی جواب دیتے نہیں بنتا، سوائے اس کے کہ اس انبیائی مشن کو اپنایا جائے، فرض منصبی ادا کیا جائے، اس کار

شیشہ وآہنگ کی انجام دہی کے لیے تیاری کی جائے اور اپنے حصے کا کام کر ڈالا جائے، تاکہ کم از کم رب کریم کے حضور شرمندگی تو نہ اٹھانی پڑے، یہ پوری کتاب دراصل غیر مسلموں میں دعوت کی اہمیت، اس کی تاریخ اور حال کے جائزے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کا لائحہ عمل پیش کرتی ہے، میری خواہش ہے کہ یہ کتاب ہر فارغ مدرسہ تک پہنچے اور ہر عالم اس پر نظر ڈالے اور ہر مدرسہ اس پر لبیک کہے، کیا خوب ہو کہ کوئی بندۂ خدا اسے ہندی کے قالب میں ڈھال کر طبع کرائے، پوری کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، پڑھنے کے بعد ہی دعوت کی اہمیت کا اندازہ ہوگا اور سمجھ میں آئے گا کہ ہم کتنے قصوروار ہیں، دعوت کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی راہ میں روڑا اٹکایا جائے تو جنگ کی بھی نوبت آسکتی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ حکمت کے ساتھ اس اہم فریضہ کو انجام نہ دینا کیسا سنگین جرم اور کیسی خطرناک غلطی ہے، اسی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف کے قلم سے ایک جملہ نکلا جو ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا: ''ایسی قصوروار قوم کے ساتھ خود ناموس فطرت آمادۂ جہاد ہو جاتی ہے''، اس جملہ کی گہرائی و گیرائی ناپیے، ملت اسلامیہ کی نازک اور منتشر ومغلوب صورت حال کا جائزہ لیجئے اور قانون الٰہی کے متعلق یہ فرمان الٰہی سنیے ولن تجد لسنة الله تبديلا جس کا مطلب صاف ہے "لن يصلح آخر هذه الأمة بما صلح به أولها" یعنی امت مرحومہ کی اس وقت حالت زار بھی وہی طریقہ اختیار کرنے سے درست ہو سکتی ہے جس طریقہ سے ابتدائی عہد میں اصلاح ہوئی تھی۔

یہ کتاب دعوتِ احتساب دیتی ہے کہ کہیں سنت اللہ کے مطابق کام کرنے میں کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر وہ نہیں ہو رہا ہے جو اساسی اور بنیادی ضرورت ومطالبہ ہے، یا جو ہو رہا ہے اس کے طریقہ میں کچھ کھوٹ تو نہیں! کچھ تو ہے! ادارے ہیں، جماعتیں ہیں، تحریکیں ہیں، خانقاہیں ہیں، اصلاحی تدبیریں اور کوششیں ہیں، إن تنصروا الله ينصركم کا وعدہ الٰہی ہے، مگر صورت حال کچھ اور ہے جو سوچنے اور محاسبہ کرنے کی دعوت دیتی ہے کہ کچھ چھوٹ رہا ہے، یا کچھ غلط ہو رہا ہے، پوری دنیا پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ سب سے زیادہ غفلت پوری دنیا اور خود اس ملک میں دعوت وتبلیغ کے ہی پہلو سے برتی جا رہی ہے، حد تو یہ ہے کہ اصلاح کی کوششوں کو تبلیغ کا نام دے دیا گیا اور تبلیغ کے اصل مفہوم ومخاطب کا تصور بھی ذہنوں سے غائب ہو گیا، لكم دينكم ولي دين کا فلسفہ بیان کیا جانے لگا جس کی گنجائش دعوت کی حجت تمام کر دینے کے بعد ہوتی ہے، مگر اتمام حجت کے بعد کے لیے دیے گئے نسخہ کو اب اتمام حجت کے کارِ دشوار سے جان بچانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا، ضرورت ہے کہ اب پھر پوری قوت وحکمت کے ساتھ، اس انبیائی مشن کو چلایا جائے اور پیام حق ہر گھر تک پہنچانے کی ذمہ داری پوری کی جائے۔ اور اس یقین کے ساتھ یہ کام کیا جائے کہ هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون (توبہ:۳۳) ''اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین برحق دے کر اسی لیے بھیجا ہے کہ ان کے دین کو تمام ادیان پر غالب فرما دے، چاہے مشرکوں کو یہ کیسا ہی برا لگے''۔

☆

نام کتاب: معاشرتی زندگی کے اصول وآداب
(قرآن وسنت کی روشنی میں)
مصنف: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۱۵۰
ناشر: حلقہ درس قرآن اقرا کالونی، علی گڑھ
ملنے کے پتے: ادارہ علوم القرآن علی گڑھ۔ ادارہ دعوت القرآن لکھنؤ۔ البلاغ پبلیکیشنز، دہلی۔

بلا شبہ قرآن مجید ایک ایسی لازوال اور کامل ومکمل کتاب ہے جو نہ صرف قوموں کے عروج وزوال کے اسباب بیان کرتی ہے،

جہاں بانی و جہاں گیری کے اصول وقوانین پر روشنی ڈالتی ہے، فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان کے موتی بکھیرتی ہے، بلکہ وہ انسان کو انسانیت سکھاتی ہے، انسان کو اس کے کریم وشریف ہونے کے عوامل واسباب سے واقف کراتی ہے، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ بیک وقت دنیا کے ہر فرد اور زندگی کے ہر شعبہ سے خطاب کرتی ہے، وہ اسرار کائنات سے پردہ اٹھاتی ہے، تکوینی وتشریعی نظام کو بیان کرتی ہے، مظاہر قدرت کا بار بار ذکر کرتی ہے، اخروی زندگی کے ذکر سے دعوت فکر وعمل دیتی ہے، توحید کے بیان میں مختلف اسالیب اختیار کرتی ہے، غفلت شعاروں کو تنبیہ کرتی ہے، راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو ہوشیار کرتی ہے، مجرمین کو وعیدیں سناتی ہے، مومنین صالحین کو وعدوں اور بشارتوں سے مہمیز کرتی ہے، اجمالی طور پر اس کتاب مقدس میں نظام کائنات کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، جنگ وامن، حکومت و سیاست، تجارت و اقتصادیات، نکاح و طلاق، عبادات ومعاملات کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے، اسی اجمال کی تفصیل پھر سیرت نبوی کے ذریعہ کی گئی ہے۔

جب قرآن مجید میں اس طرح زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ زندگی کے انتہائی اہم پہلو سے اعراض کیا جاتا، یعنی معاشرتی احکام نہ بیان کیے جاتے، زندگی گذارنے کا طریقہ نہ سکھایا جاتا، روز مرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات کو نظر انداز کیا جاتا، جبکہ قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد ہی انسانیت کی تہذیب وتثقیف اور ہدایت ہے۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے اسی اہم پہلو کو موضوع بحث بنایا، ان کے پیش نظر قرآن مجید پر عمل سے پہلو تہی اختیار کرنے کی روش تھی، اس لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ معاشرتی زندگی کو قرآن کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جائے، پروفیسر اصلاحی لائق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی تمام تر علمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنی دعوتی کوششوں کو جاری رکھا ہے، اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے عملی پہلو یا یوں کہیے کہ عملی کوتاہیوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے، ورنہ راقم کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ عام طور پر ہمارا تعلق مع القرآن اور رجوع الی القرآن کا نعرہ عملی طور پر پژمردگی اور بے اعتنائی کا شکار ہوتا ہے، ہمارے مذاکرات اور دروس کے حلقے بھی محض علمی نکتہ سنجیوں کی نذر ہوجاتے ہیں، اور قرآن کا اہم اور بنیادی حق ''قرآن پر عمل'' پورا نہیں ہو پاتا، غالبا یہ مفید ترین کتاب پروفیسر اصلاحی کے دورس قرآن کا نتیجہ ہے، انھیں معاشرے کی بے راہ روی بلکہ غیر اسلامی معاشرت وطرز زندگی نے یہ سوچنے اور لکھنے یا دروس قرآن کے لئے یہ موضوعات اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، جس کا اظہار انھوں نے اپنے پیش لفظ میں کیا ہے، ''اس سے انکار نہیں کہ معاشرتی زندگی سے متعلق قرآن وسنت میں جو اصول وآداب ملتے ہیں ان سے مختلف ذرائع سے واقفیت ہوتی رہتی ہے، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انھیں عملی طور پر برتنے کے باب میں عام طور پر غفلت وبے توجہی پائی جاتی ہے''۔ (ص:۱۰، کتاب ہذا) ساتھ ہی انھوں نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے: ''معاشرتی زندگی کے مسائل ومعاملات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ایک مختصر کتاب میں ان سب کا احاطہ مشکل ہے، پیش نظر کتاب میں خاص طور سے معاشرتی زندگی کے ان مسائل سے متعلق قرآن وسنت کے اصول وآداب واضح کیے گئے ہیں جو روز مرہ زندگی میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ (کتاب ہذا، ص:۱۰)

اسی بے توجہی، بے عملی اور غفلت کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری زندگیوں میں اسلام رسمی سا بن کر رہ گیا ہے، چند ایک امور ہیں جن میں اسلام کو سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے، اسلام کا اپنا ایک ایسا صالح، پاکیزہ اور پرامن طرز معاشرت ہے جس کی آغوش میں آکر دنیا کی سب سے بڑی دولت ''سکون'' سے آشنائی ہوتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہر محاذ پر پسپائی کے ساتھ ساتھ معاشرتی طور پر بھی ہم دوسروں کے طور طریقے اپنانے کو معراج کل سمجھتے ہیں، اسے فکری ارتداد سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی طور طریقے اپنانے میں ہم کو عار

محسوس ہوتی ہے، اسی عار کے سبب ہم بسا اوقات چاہتے ہوئے بھی اسلامی آداب سے گریز کر جاتے ہیں، جبکہ سچی بات یہ ہے کہ قرآن وشریعت سے بے اعتنائی کے سبب اب اکثریت کو اسلامی اصول وآداب کی خبر ہی نہیں رہی، بعض مرتبہ کسی سے کہیے کہ اس سلسلہ میں سنت یہ ہے اور اسلامی رہنمائی یوں ہے، تو وہ تعجب سے پوچھتا ہے، اچھا اسلام اس چھوٹے سے مسئلہ میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔

قابل صد مبارکباد ہیں پروفیسر اصلاحی صاحب جنہوں نے اس پہلو پر توجہ کی اور اس اہم علمی مگر سادہ وعام فہم کتاب کے ذریعہ قرآن وسنت سے ثابت اصول وآداب معاشرت کو رواج دینے کی فکر کی، پروفیسر اصلاحی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زبان سادہ اور عام فہم استعمال کرتے ہیں، فلسفیانہ گتھیوں میں نہ الجھتے ہوئے خیر و ہدایت کے پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن سے استفادہ کرتے وقت سیرت وسنت اور ذخیرہ حدیث سے بھر پور روشنی حاصل کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں خلوص و افادیت کا پہلو غالب رہتا ہے۔

زیر نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، بالترتیب جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ آداب معاشرت قرآن وسنت کی روشنی میں
۲۔ زندگی کے ہر معاملہ میں معتدل رویہ-قرآن وسنت کا مطالبہ
۳۔ سماجی برائیوں کا انسداد اور قرآنی تدابیر
۴۔ خلقِ خدا کو نفع رسانی اور اس کے فیوض وبرکات قرآن وحدیث کے حوالے سے
۵۔ معاشرہ میں خیر کا فروغ اور اس کے ثمرات قرآن وحدیث کی روشنی میں

ان مرکزی عناوین کے تحت پروفیسر اصلاحی نے متعدد معاشرتی پہلوؤں پر قرآن وسنت سے ماخوذ رہنمائیاں پیش کی ہیں، جو خیر کے فروغ کے لیے معاون ومفید اور انسداد فواحش ومنکرات کے لیے کارگر ہیں، کتاب کے تمام مباحث ومشمولات آیات قرآنی اور حدیث نبوی کی براہ راست توضیح وتشریح ہیں، اس حیثیت سے کتاب کی معنویت دوبالا ہو جاتی ہے۔

راقم سطور کی نظر میں یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کو ہر مسجد اور ہر گھر میں رکھا جائے اور مسجد وگھر کے تعلیمی حلقوں میں اس کے مباحث کو بار بار پڑھ کر سنایا جائے، یہ کتاب صالح اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی دعوت دیتی ہے، فکری ارتداد سے حفاظت کا کامیاب نسخہ فراہم کرتی ہے، اسلام کی کاملیت پر روشنی ڈالتی ہے، اسلامی تہذیب و معاشرت کے فروغ کی دعوت دیتی ہے، کامیاب زندگی کے گُر بتاتی ہے، اسلام کے معتدل مزاج کی خوبصورت تشریح کرتی ہے، یاد رکھنے کی بات ہے کہ زبان ہو یا دین اگر عملی زندگی سے نکل جائے، جس کی ابتدا عام طور پر روزمرہ کی گھریلو زندگی سے ہوتی ہے، تو پھر اس سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے، ایسی خلیج پیدا ہوتی ہے جس کو پاٹنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر اس کے نتائج بہت بھیانک ہوتے ہیں، آج کل بے دینی بلکہ لادینی، گمراہی اور مغربیت زدگی اور اس سے آگے بڑھ کر ارتداد کے واقعات اسی بے عملی اور معاشرتی بے توجہی کا نتیجہ ہیں، اس صورت حال میں یہ اور اس جیسی کتابیں ہر فرد اور ہر گھر کی ضرورت ہیں، اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کوشش کو قبول فرمائیں اور اس کو اسلامی معاشرت کے فروغ کا ذریعہ بنائیں۔

☆☆☆

اخبار عالم

اخوان کے نائب مرشد عام ابراہیم منیر کی وضاحت

رپورٹ: طہ العیسوی

ترجمانی: محمد پاشا ندوی

تحریک اخوان المسلمین کے نائب مرشد عام ابراہیم منیر نے ان بیانات کی سخت مذمت کی ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ القاعدہ داعش جیسی تمام دہشت گرد تنظیموں کے لئے تحریک اخوان جد امجد کی حیثیت رکھتی ہے، اور ان تمام کا مقصد فساد وانتشار پھیلانا اور پرامن فضا کو مکدر کرنا ہے۔

بے بنیاد جھوٹے الزامات کی سچائی سے متعلق عربی 24 نامی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے ابراہیم منیر کا کہنا تھا کہ پوری دنیا اس بات سے واقف ہے کہ اخوان کی فکر ایک صحیح اور معتدل اسلامی فکر ہے، جس کا شدت پسند تنظیموں سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں، ظلم و زیادتی اور شدت پسندی کسی بھی شکل میں ہو اخوان اس کی تردید اور پرزور مذمت کرتی ہے۔

انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اخوانی فکر تمام پہلوؤں اور تمام تفصیلات کے ساتھ پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے، یہ الگ بات ہے کہ الزام لگانے والوں نے اس کے تاریخی حقائق سے چشم پوشی کی ہے، اور اس کا مطالعہ تو دور خود اپنے ملک کی تاریخ اور وہاں کے قائدین اور انصاف پسند علماء کو نہیں پڑھا جن میں مرحوم شاہ فیصل سرفہرست تھے جو اخوان کی فکر اور اس کے کارناموں کو سراہتے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں جب ہم مارکسزم، کمیونزم، نیشلزم، عرب قوم پرستی اور ناصریت جیسے باطل افکار کے حملوں کا سامنا کر رہے تھے اس وقت تحریک اخوان ہی تھی جس نے بہت سے خطوں بشمول سعودیہ عربیہ کو اس طرح کے منحرف افکار کے حملوں سے محفوظ رکھا، اگر بے بنیاد الزام لگانے والے اپنے ملک کے تاریخی دستاویزوں کی طرف رجوع کر لیتے تو ان کے سامنے یہ بات آشکارا ہو جاتی کہ اللہ کے فضل کے بعد تحریک اخوان ہے جس کی وجہ سے آج ان کے ملک میں ایک اسلامی دینی پرامن فضا قائم ہے اگر تحریک اخوان نہ ہوتی تو آج یہ فضا قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

انہوں نے مزید کہا کہ وقتا فوقتا لگائے گئے یہ الزامات اور بے بنیاد باتیں بڑی افسوسناک اور تکلیف دہ ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ ناقابل قبول ہیں، تمام خلیجی ممالک اخوان کے اس کردار سے بخوبی واقف ہیں جو اس نے ان کے باشندوں کو شدت پسندی و زیادتی پر مبنی افکار وخیالات سے متاثر ہونے سے بچانے اور صحیح معتدل فکر کو فروغ دینے میں ادا کیا۔

اس سلسلہ میں ہم صرف وضاحت کر سکتے ہیں، ورنہ تاریخ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بہترین گواہ ہے۔

مصر کی فوج اور اس کے حامیوں کو چھوڑ کر ساری دنیا یہی کہتی ہے کہ اخوان کی فکر شدت پسندی کے مخالف ہے، اور برطانیہ اور دیگر ممالک کی تحقیقات اس کی گواہ ہیں، ہم اخوان مخالف ذہن رکھنے والوں سے کہتے ہیں کہ آپ پہلے اپنے ملک کی تاریخ پڑھیں، پھر حق بات کہیں اگر چہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو، نہ کہ ان واضح اور روشن حقائق کو لوگوں کے سامنے توڑ موڑ کر پیش کریں اور ان کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں۔

ابراہیم منیر نے کہا: اخوان کا دعوتی مشن جاری وساری ہے، اور

آئندہ بھی وہ اپنے مذہب وملت اور وطن کی خدمت جاری رکھے گی، اخوان کے موقف میں کوئی تبدیلی یا توقف کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ وہ نئے حوصلوں اور نئی امنگوں کے ساتھ امت کی بھلائی وخیر سگالی کے مشن کو جاری رکھے گی، اور ترقی وکامیابی کی منزلیں طے کرے گی۔

نائب مرشد عام نے اس بات کی صراحت کی کہ حال میں اخوان کی جو مخالفت کی گئی یہ کوئی پہلا موقع نہیں، بلکہ اس پر ہمیشہ اس طرح کے حملے ہوتے آئے ہیں، کیوں کہ یہ تو ضابطۂ کائنات ہے کہ حق وباطل کے درمیان مزاحمت اور کشمکش ہمیشہ سے چلی آرہی ہے، حق ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، دیر سویر آخر فتح اسی کی ہونی ہے، وقل جاء الحق وزهق الباطل إن الباطل كان زهوقا (ترجمہ: حق آگیا باطل مٹ گیا اور باطل مٹ کر ہی رہتا ہے)۔ ماضی میں بھی کچھ سرکش ظالموں نے اخوان کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جبکہ اخوان اپنے موقف پر پوری شدت کے ساتھ قائم رہی ہے، اس طرح کی کوشش اس کو متزلزل نہیں کرسکی، بالآخر ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ اور اخوان کی فکر مومنین کے دلوں میں جاگزیں ہوتی گئی اور اس کی وقعت واہمیت میں مزید اضافہ ہوتا گیا، اخوان نے پیچھے ہٹنے کے بجائے بے خوف وخطر ان باطل افکار کی بیخ کنی کی اور جو باطل افکار وخیالات اس کے وجود کو ختم کرنا چاہتے تھے، اللہ کے فضل و احسان سے پوری امت نے ان باطل افکار کو یکسر نکار دیا، کاش کہ یہ مخالفین ان حقائق کا مطالعہ کرتے اور ان کو سمجھتے اور جان لیتے کہ ایک نہ ایک دن اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، تب سب کچھ واضح ہوجائے گا۔

ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ مخالفین اخوان کی فکر اور اس کی خدمات کو سمجھتے تو سب سے پہلے یہی اخوان کا دفاع کرتے۔ ابراہیم منیر نے یہ بھی کہا کہ اخوان مخالف موقف رکھنے والے حضرات اگر واقعی اپنے دعووں میں مخلص ہیں تو ہم ان کو اخوان کی فکر کے ایک ایک نکتہ پر بحث کرنے کے لئے پوری دنیا کے سامنے ایک سمینار یا ڈائیلاگ میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اور ہم خود اس طرح کے بین الاقوامی سطح کے سمینار یا ڈائیلاگ میں شرکت کرنے کے لئے پورے طور پر تیار ہیں تاکہ سب کے سامنے یہ بالکل واضح ہوجائے کہ حق کیا ہے۔

ہم نے کبھی نہ شدت پسندی کی دعوت دی اور نہ ہتھیار اٹھانے کی اور نہ ہی کسی پر الزام تراشی کی، ہمارے اور ان کے نظریات میں واضح فرق ہے، ہماری فکر بالکل صاف شفاف مبنی بر صداقت ہے جبکہ ان کی اس کے بالکل برعکس، اس کے باوجود امت بلکہ پوری انسانیت کی فلاح کے پیش نظر ہماری جانب سے ان کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ پوری دنیا کے سامنے کسی سمینار یا ڈائیلاگ کی میز پر آئیں، تاکہ ہم اپنے موقف کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرکے حقیقت کو واشگاف کرسکیں، ہم مخالفین کی اوٹ پٹانگ باتوں اور بے جا الزامات کی پرزور تردید کرتے ہیں، جب کہ وہ خود دل سے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان میں کوئی صداقت نہیں، ہم اخوان کی فکر کے سلسلہ میں معروضی اور تعمیری تنقید کے لیے ہمہ وقت کھلے دل سے تیار ہیں، اور تمام لوگوں کے مخلصانہ وخیر خواہانہ مشوروں کا استقبال کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ مخالفین اپنا رویہ تبدیل کرلیں گے جس کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں نے قتل، جلا وطنی اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

افسوس ہے کہ مخالفین ہر اس فکر سے ڈرتے ہیں جو آزادی، جمہوریت وانصاف پر مبنی ہوتی ہے، جس کی صدا یہ ہوتی ہے کہ ملک کے ہر شہری کو اقتصادی اور مذہبی مکمل آزادی ہو، ملک کا ہر شہری اپنی صحیح فکر کے ساتھ آزادانہ طور پر عبادت کرنے اور اپنے ملک کے منافع وخیرات سے بلا کسی روک ٹوک جمہوری طریقہ پر فائدہ اٹھا سکے، اور اپنے ملک کی ترقی اور امن وامان قائم رکھنے میں مکمل طور پر شریک ہوسکے، وہ ہر اس فکر سے خوفزدہ ہیں، جو ملک کے اندر حقوق انسانی کی پاسداری وراس بات کی داعی ہے کہ ملک کا ہر باشندہ آزاد ہے نہ کہ غلام۔

ابراہیم منیر نے اس پر بڑا زور دیا کہ تحریک اخوان کی فکر بالکل صاف وشفاف ہے، اور وہ اپنی اس فکر پر ہمیشہ قائم رہے گی اور اپنے تعمیری مشن کو جاری رکھے گی۔

☆☆☆